ساجد خان......فکروفن

مرتب

محمد بشیر رانجھا

سُلطانُ پَبُلِشَرُزُ

14 قاضی سعید مارکیٹ، ڈھوک سیداں روڈ، کمال آباد-III، راولپنڈی کینٹ

email:bashirranjha18@yahoo.com

Ph: + 92 300 5119565

اشاعت اول: ۱۸ رمضان المبارک ۲۰۱۹ء

اہتمام محمد بشیر رانجھا

ساجد خان ----- فکروفن ا (مرتب) محمد بشیر رانجھا

صفحات: ۹۶ تعداد: ۵۰۰

قیمت: (اندرون ملک) 250روپے

(بیرون ملک) (برطانیہ)20پاونڈز

(امریکہ)40امریکی ڈالر

Sajid Khan-----Fikr - O - Fun/Muhammad Bashir Ranjha

Rawalpindi(Pakistan):Sultan Publishers:2019

96pp.

ISBN 978-969-9965-08-4

ہمارے رابطہ

محلہ جیگی بازو ریلوے اسٹیشن ----- حویلیاں، ضلع ایبٹ آباد

ٹیلیفون: 0300-5050775/0333-5050775

ناشر

سُلطانُ پَبلشَرزُ

14 قاضی سعید مارکیٹ، ڈھوک سیداں روڈ کمال آباد –III، راولپنڈی کینٹ

email:bashirranjha18@yahoo.com

Ph: + 92 300 5119565

انتساب

مریم نور اور سلمیٰ نور

کے نام

فہرست

مجھے روشنی چاہیئے

دائرے کا اسیر

انتخاب

☆......مجھے روشنی چاہیے (افسانہ) ساجد خان

☆......دائرے کا اسیر (افسانہ) ساجد خان

مجھے روشنی چاہیے

پروفیسر محمد زمان مضطر

ہر سمت اندھیرا ہے مجھے روشنی چاہیے
بے نُور سویرا ہے مجھے روشنی چاہیے

تا دُور شبِ تارِ بلا چھائی ہوئی ہے
تا حدِ نظر کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے
اب ہاتھ کو بھی ہاتھ سجائی نہیں دیتا
آنکھوں میں بھی اِک دُھند سی لہرائی ہوئی ہے
ہر سمت اندھیرا ہے مجھے روشنی چاہیے
بے نُور سویرا ہے مجھے روشنی چاہیے

کرنوں سے نہ ہو جسکی زمانے میں اُجالا
اُس مہرِ دَرخشاں کی ضرورت نہیں مجھ کو
چمکائے نہ آنگن کو مرے چاندنی جس کی
ایسے مہِ تاباں کی ضرورت نہیں مجھ کو
ہر سمت اندھیرا ہے مجھے روشنی چاہیے
بے نُور سویرا ہے مجھے روشنی چاہیے

پُر ھول ، سیہ رات ہے ہر سُو ہی خدایا!
اب حامی و ناصر ہے مرا تُو ہی خدایا!
یہ انجم و مہتاب تو بے نُور پڑے ہیں
اَب بھیج دے میرے لئے جگنو ہی خدایا!
ہر سمت اندھیرا ہے مجھے روشنی چاہیئے
بے نُور سویرا ہے مجھے روشنی چاہیئے

ہر شخص سمندر کا ہے ایک ایک جزیرہ
ہر شخص ہے اس بحرِ حیاتی کا فسانہ
لے آیا ہے ساجدؔ بھی کچھ ایسے فسانے
رکھے گا جنہیں دیر تلک یاد زمانہ
کہتا ہے فسانوں میں وہ محبوب سے اپنے
پردہ رُخِ روشن سے ذرا تم ہی اٹھانا
ہر سمت اندھیرا ہے مجھے روشنی چاہیئے
بے نُور سویرا ہے مجھے روشنی چاہیئے

آتش زیرِ پا رکھنے والا تخلیق کار

محمد بشیر رانجھا

جاوید شاہین کا ایک مقطع ہے:

بات جو دِل میں ہے کھل کر اُسے کہہ دے شاہیؔن
کیا خبر کل کو یہ آشفتہ بیانی نہ رہے

"مجھے روشنی چاہئیے"......ساجد خان کے پچیس افسانوں اور کہانیوں پر مشتمل اس کا اوّلین مجموعہ ہے۔ساجد خان ہمارے عہد کا ایک ایسا افسانہ نگار ہے جو روایت شکن بھی اور روایت ساز بھی۔وہ اظہار اور موضوعات کی ترسیل کے معاملے میں "گائیڈڈ میزائل" کا ہمسفر نہیں۔اس کا فکری بہاؤ اور جذباتی تحرک متعین منزل پر پہنچنے کے بجائے تخیل اور تجربے کے کھلے میدانوں میں صحرائی ریت کی مانند شش جہت میں پھیلتا نظر آتا ہے۔اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ اس کا اپنا کوئی ویژن نہیں......وہ ہر شے، واقعے، تجربے، واردات اور معاملے کی تہوں میں اتر کر حقائق اور اصلیتوں سے ایسی صورتیں اُجاگر کرتا ہے جنہیں دیکھ کر قاری نتائج اور مقاصد تک از خود پہنچنے کی سبیل ڈھونڈ لیتا ہے۔

ولیم جیمز کہتا ہے کہ "تجربہ کبھی محدود نہیں ہوتا کیونکہ یہ کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔یہ ایک وسیع صلاحیت کا احساس ہے......مکڑی کا بہت بڑا جالا ہے......جس کا تانا بانا نہایت مہین اور ریشمی دھاگوں سے بنا ہے۔یہ جالا اِنسانی شعور کے کمرے میں پھیلا ہے۔اس کی گرفت میں چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ آجاتا ہے۔اسے شعور کی فضائے محیط کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔اگر شعور زبردست قوتِ تخیل کا مالک ہے یا کسی نابغے (جینئس) کا شعور ہے تو کوئی شے اس کے دائرے سے خارج نہیں رہتی"۔

ساجد خان کے تجربے کو اسی حوالے سے متعین کیا جا سکتا ہے۔اس کا شعور ٹکڑوں میں بٹا ہوا نہیں

بلکہ ایک تجرباتی ٹمل سے متعلق ہے۔اس کے شعور کی فضائے محیط نے ان افسانوں کو مخصوص لب و لہجہ عطا کیا ہے۔اس کے افسانوں میں تجربے محض تجربے نہیں رہتے کہ وہ اپنے وجودی نکھار سے بے نیاز ہو جائیں اور اپنے جذبوں بھرے شعوری رویّوں کا اظہار بھی نہ کرسکیں۔اس کے تجربے اس کی عملی زندگی کے خمیر سے تیار ہوئے ہیں۔

ساجد خان کا فن نہ تو جذبات وافکار کی پیچیدہ اکائیوں سے مرتب ہونے والا کوئی حل شدہ ریاضیاتی فارمولا ہے، نہ ہی کوئی امتحان پاس کرنے کے لئے ہِٹ تھرو گائیڈ اور نہ ہی اس کا تعلق کسی دائیں بائیں کی منشوریاتی راہِ عمل سے ہے۔ساجد خان اپنے بہت سے ہم عصر افسانہ نویسوں کی مانند سستی جذباتیت، نرم وملائم اظہاریت، جنسی نشاطیت اور جسمانی مقناطیسیت کے حربوں سے کام لینے کو معیوب جانتا ہے اور سستی شہرت حاصل کرکے ٹمبل ناک بننا اس کا مسئلہ ہرگز نہیں۔اس کے برعکس وہ اپنے گردوپیش کے حالات کی عذاب آفرینیوں میں فرد کی بے حسی اور اپنے خول میں سمٹ جانے کے عمل پر احتجاج کرتا ہے۔وہ کچلی روحوں اور بے بس نسلوں کو زندگی کے حقیقی معانی جاننے کی اہمیت پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔

ساجد خان کارزارِ حیات میں دوستی اور دشمنی کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہے اور سماج میں زندگی کی میکانکیت اور یکسانیت سے نالاں بھی ہے۔جذبوں کی نارسائی کا اُسے شدید قلق ہے۔اُسے یہ جذبے آنکھ کنارے ٹوٹی پتنگ کی مانند نظر آتے ہیں۔آس اور اُمید دِلاتے لمحے اُسے پریشان کرتے ہیں۔تجارتی رشتوں کے سماج میں اُسے اپنا وجود اُس بوسیدہ کپڑے کی صورت نظر آتا ہے جسے نہ پہنا جاسکتا ہے اور نہ ہی سنبھال کر رکھا جاسکتا ہے۔اُس کے شہرِ محبت میں ایسے کوڑھ زدہ وجودوں کی بہتات ہے جن کا علاج محبت کی بارش کے سوا کچھ نہیں۔بے یقینی اور نا اُمیدی کی تاریک دلدلوں میں ڈوبتے ضمیر ساجد خان کو ہانٹ کرتے ہیں اور وہ چیخ اٹھتا ہے۔اُسے بولتی زبانوں پر سنہری تالے نظر آتے ہیں اور اُسے ہر سماجی قدر میں سرمائے کی سکاچ ٹیپ کا عمل دخل نظر آتا ہے۔وہ "حقِ ملکیت" جتانے کے خلاف ہے...... ہر نوع کی حقِ ملکیت کے خلاف......وہ

دولت، محبت اور عقیدت کی مساویانہ تقسیم کا علمبردار ہے اور محبت میں بغاوت اور احتجاج کو اپنا بنیادی حق سمجھتا ہے۔

آزادی ساجد خان کے وجود کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اُس کا کہنا ہے کہ آزادی سرمائے سے سلب ہوتی ہے اور اس کے ذریعے انسانوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے لیکن اُس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے اس لئے وہ آزاد ہے۔ جب وہ اپنے گردوپیش میں معصوم انسانیت کی پناہ گاہوں کی کے بجائے جبری مشقت اور چائلڈ لیبر کے ایسے اڈے موجود پاتا ہے جہاں معصوم بچوں سے اُن کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کی قربانی لے کر جانوروں کی طرح دن رات مشقت کرائی جاتی ہے تو اُسے سماج کے ایسے طبقات سے نفرت ہونے لگتی ہے جو اِن ننھے فرشتوں کی تکالیف کا باعث ہیں ...... ایسے ماحول میں اُس کا جی متلانے لگتا ہے۔

ساجد خان کی کہانیوں اور افسانوں میں وجودی رشتوں کی بھرپور شکلیں اُجاگر ہوئی ہیں۔ ابلاغ، آزادی، وابستگی، موت اور زندگی کی جدلیات، بے معنویت، ذہنوں کا بنجر پن، احتجاج، مزاحمت، محبت، وجود اور سیاست، وجود اور معاشرت، وجود اور وجود کی آویزش، اُداسیاں، بے ہنگم کام، بے آس تنہائیاں، اِنسان اور اِنسانی رشتوں کے مابین فاصلے، بھوک، ناداری، غربت، جرم و سزا، عدم وصال، روحوں کا نیلام، اجنبیت، جلاوطنی اور اُس کا عذاب، افیونی قدریں، سردمہریاں، سجے اور آراستہ وجودوں کی طراریاں اور بربادیاں، خودشناسی، خواب اور حقیقت کا اِتصال، ڈر، دہشت گردی، لاشیں اور انسانی آرزوؤں کی تاراجی اور اس قسم کے دیگر لاتعداد تاثرات، تلازمات اور موضوعات اس کے افسانوں کی بُنت میں شامل ہیں۔

ساجد خان چونکہ افسانہ نویس ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا شعری ذوق بھی رکھتا ہے اور اس ذوق کی تسکین کے لئے وہ اکثر شعراء کی محافل میں نظر آتا ہے۔ یوں اُس کی تحریروں میں "قلم کارواں حویلیاں" کے شعراء کی دوستی اور اُن کے ساتھ نشست و برخاست کے اثرات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ...... جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اُس کی کہانیوں کے پس منظر میں ن م راشد کی سی روایت

شگفتگی بھی ہے اور افتخار جالب کی لسانی توڑ پھوڑ بھی ...... میرا جی کا سادہ اور اتھاہ گہرائیوں سے معمور اسلوب بھی ہے اور مجید امجد کی جزئیات نگاری بھی ...... لیکن اس سب کے باوجود اُس نے اپنا ایک منفرد رنگ بھی جمانے کی کوشش کی ہے۔ سیدھے سپاٹ لہجے میں بات کر جانے کی تکنیک میں اُس کی ذات اور شعور کا بھرپور اظہار اُس کی مہارتوں کا نقیب ہے۔

جدید فلسفیوں اور خاص طور پر وجودیت اور تصوف کے مطالعے نے ساجد خان کے شعور کو نئی جہتیں عطا کی ہیں اور اُسے اپنے جذبے اور شعور سے مکمل طور پر آگاہی ہے ...... ساجد خان کے افسانوں اور کہانیوں کا نفسیاتی اور حسی تجزیہ کرتے ہوئے اُس کے اسلوب کی برجستگی اور بے تکلفی کی داد نہ دینا بھی ناانصافی ہوگی۔ اُس کی توجہ نہ تو صناعی کی جانب ہے اور نہ ہی اسلوب کے بناؤ سنوار کی جانب ...... لفظوں کی نشست و برخاست کا ریاضت طلب معاملہ اُس کے لئے اہم نہیں ...... وہ خیال اور جذبے کے بہاؤ میں بہتا ہے اور ہر نوع کے الفاظ میں اپنے مفاہیم کو منتقل کرتا چلا جاتا ہے۔ ہندکو، انگریزی، پنجابی اور دیگر زبانوں کے الفاظ اردو اسلوب اور روائتی آہنگ میں استعمال کرنا اُس کے لئے ممنوع نہیں ہے۔

ساجد خان متوسط طبقے کا پڑھا لکھا باشعور نوجوان ہے۔ وہ نئی نسل کا بظاہر دھیما لہجہ رکھنے والا آتش زیرِ پا تخلیق کار ہے۔ اس زیرِ پا آتش کا مرکز اُس کا تندور کی مانند دہکتا قلب ہے۔ اِس آگ کو ہوا دینے کا کام اُس کے دماغ کے ذمے ہے۔ ساجد خان کی کہانیاں ایسی خود کلامی ہیں جس میں ہمکلامی اور خارجی آوازیں بھی شامل ہیں۔ اُس کے لفظوں میں اُس کے احتجاجی لہو کا پارا بھرا ہوا ہے اور اُس کے افسانوں میں جبر کی بستیوں کو خاکستر کر دینے والا لاوا بھی ہے۔ اُس کے تخیلہ کے جال میں وہ سب گندی مچھلیاں گرفتار ہوئی ہیں جنھوں نے زندگی کے شفاف اور خوبصورت تالاب کو خراب کر رکھا ہے۔

ساجد خان کے افسانے اُس کے سچے اور حقیقی تجربوں سے کشید ہوئے ہیں۔ اُس کی کہانیاں اور افسانے نہ تو لذتِ وصال سے بھرپور ہیں اور نہ ہی کربِ ہجر کی لایعنی داستانیں ...... اور اُس کے

افسانوں میں سماجی سمجھوتہ بازی اور کچی رومانویت کے عناصر بھی دستیاب نہیں ہیں۔ وہ جس قسم کے ماحول میں رہا، جیسی اس کو دوستوں کی محفلیں میسر آئیں، گردو پیش میں جس صورت حال سے واسطہ پڑا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کے شعور کی باطنی آنکھ نے اُس کے گردو پیش کے تجربوں کو جس کینوس پر ترتیب دیا یہ کتاب اِس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ساجد خان نے زندگی کے تجربات کو جس خلوص اور دیانت کے ساتھ اپنے افسانوں اور کہانیوں میں سمیٹا ہے یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ اِس کتاب کی اشاعت کے بعد مجھے یہ پیشگوئی کرنے میں کوئی باق نہیں کہ مستقبل قریب میں اُسے اپنے فکری وفنی اسلوب، اظہار اور ڈکشن کی وجہ سے ایک منفرد اور واضح شناخت بنانے میں کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات

ڈاکٹر کاشف بٹ

کہتے ہیں آدم نے سیب کھایا تھا تو اسے جنت سے نکالا گیا تھا۔ایسا بھی سنتے ہیں کہ آدم کے ہاتھوں میں خوشۂ گندم تک جانے کی پاداش میں زمین کے سفر کا پروانہ تھما دیا گیا۔شجرِ ممنوعہ کی وضاحت میں بعض لوگ اس سے ہٹ کر بھی توجیہات پیش کرتے ہیں۔خیر قصہ جو بھی ہو قصہ قصہ ہے اور یہی مختلف اندازِ بیاں تخلیقِ آدم کے ساتھ کہانی کے آغازِ سفر کی تائید کرتے ہیں۔میرا مقصود بنی نوعِ انسان کے ساتھ کہانی کی نسبت بیان کرنا ہے۔البتہ یہ بحث کہ کہانی لکھنا کب شروع ہوا ایک الگ دفتر کی متقاضی ہے۔

میرے نزدیک انسان کا سب سے مضبوط رشتہ کہانی کے ساتھ ہی ہے۔ہر انسان انگنت کہانیوں سے جڑا ہوا ہے۔یہ الگ بات کہ اپنی کہانی کا مرکزی کردار ہونے کے باوجود ہر انسان کہانی کار نہیں ہوتا۔چونکہ کہانی کار ہونے کے لئے جس صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اللہ تعالی منتخب انسانوں کو ہی ودیعت کرتا ہے۔ساجد خان وہ کہانی کار ہے جو کائنات کی کوکھ سے کہانی کشید کرتا ہے۔وہ مرتی ہوئی انسانیت کو اپنی کہانی میں ایک نئے جنم کی بشارت دیتا ہے اور یہی فن اُسے تخلیق کار کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ساجد خان جو کردار تخلیق کرتا ہے ان میں اپنے تخیل سے ایسے رنگ بھرتا ہے جو کبھی پھیکے نہیں پڑتے۔وہ معاشرے کے ننگے کرداروں کو اس فنکاری سے لبادے اوڑھاتا ہے کہ کہانی کو عریانیت سے بھی صاف بچا لیتا ہے اور کرداروں کے عوامل کی کارفرمائی بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

زندگی ساجد خان کے افسانوں میں اپنے ہر رنگ کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے۔موسموں کا تغیر اور گردشِ حالات اس کے افسانوں میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔وقت کروٹ بدلتا ہے تو حادثات اور سانحات تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں اور جب ساجد خان کا قلم کاغذ پہ

زاویے بدلتا ہے تو سماج کے اتار چڑھاؤ افسانوی ادب کا حصہ بن جاتے ہیں۔بدلتے وقت کی پرچھائیاں انسانیت پہ جو اثرات مرتب کرتی ہیں انہیں ساجد خان نہایت دلکش انداز میں ادب کی مالا میں پروتا ہے۔اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور وہ اسی زندگی کا تجزیہ اپنے افسانوں میں کرتا ہے۔

صد حیف! ہمارے ہاں مسند نشیں اپنے منصب کے تقاضوں سے آگاہی نہیں رکھتے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شعبہ ہائے زندگی میں تنزلی کا سفر تیزی سے جاری ہے۔انہی مسند نشینوں کی کارفرمائیاں ساجد خان نے اپنے افسانوں میں اُجاگر کی ہیں۔بظاہر ہمارے سماج میں ہر انسان کو آزاد تسلیم کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت اسی سماج سے جڑے انسانوں کی زندگی اس نہج پر پہنچ چکی ہے جو غلامانہ طرزِ زندگی سے کسی طور کم نہیں۔معاشرتی تقسیم نے انسانوں کے بیچ ایسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں جن کے انہدام کے لئے شاید قیامت تک انتظار کی سولی پہ جھولنا پڑے۔معاشرتی تقسیم اور مسند نشینوں کی بزم آرائیاں معاشرے پہ جو اثرات مرتب کرتی ہیں ان کی گہری جھلک "مجھے روشنی چاہیئے" میں موجود ہے۔

جس طرح رشتوں کا باہمی ربط اور تقدس ہمارے معاشرے میں پائمال ہو رہا ہے اس کی مثال عہد رفتہ میں کہیں نہیں ملتی۔ساجد خان نے اپنے گردوپیش کا عمیق نظر سے مشاہدہ و مطالعہ کیا ہے اور اس تجربے کو اپنے افسانوں میں نہایت عمدگی سے پیش کر دیا ہے...... یوں اس نے حقیقت کو افسانے کی بنیاد بنا دیا ہے۔وہ معاشرے میں رائج اصولوں اور قوانین کے سیاہ چہرے سے پردے ہٹاتا نظر آتا ہے۔اس ننگے معاشرے کو جس کفن کی ضرورت ہے اسے لبادے کی صورت پیش کرنے والا ساجد خان ہی ہے۔میں حیران ہوتا ہوں کہ موضوعات میں وہ باریک بینی جس تک اکثر منجھے ہوئے تخلیق کاروں کی نظر نہیں پہنچتی وہ ساجد خان کی دسترس سے بچ نہیں پاتی۔ ایسے ہی فنکاروں کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پیدا ہی تخلیقِ فن کے لئے ہوئے ہیں۔

ساجد خان اپنے اس ابتدائی افسانوی مجموعہ کے ساتھ گلشنِ ادب میں تازہ کاری اور خوبصورت

کلیوں کا گلدستہ لئے داخل ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقت میں ساجد خان دنیائے ادب میں ایک ایسے معیار کی بنیاد بن جائے گا جو آئندگان کے لئے سرچشمۂ فیض ہوگا۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

سلگتے اَلمیے

محمد اسفر آفاقی

غمِ ہستی کی زنجیروں سے انساں کو کہاں فرصت
کہیں حالات ظالم ہیں کہیں تدبیر ظالم ہے

آج کا انسان حالات کے دھارے پر تنکوں کی طرح بہے جا رہا ہے۔ یہ ایک واشگاف حقیقت ہے کہ انقلابِ زمانہ کی ستم ظریفیوں سے کوئی بھی فرد نہیں بچ پاتا۔ کائنات کے سبھی رنگ انسانی حسیات سے ہم آہنگ ہیں۔ یہ رنگ کبھی چھلکتے آنسوؤں میں جھلکتے ہیں اور کبھی سسکیوں اور آہوں میں مچلتے ہیں۔ زندگی کا کارواں کہیں رُکتا نہیں۔ زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ چیزیں معدوم ہو جاتی ہیں اور نئی دُنیا کے ساتھ نئے حالات اور نقشے سامنے آجاتے ہیں۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ انسانی المیوں کے وقوع پذیر ہونے کے عمل اور عہد میں ہی کہیں ہمارے آس پاس ایک ایسا تخلیق کار بھی ہوتا ہے جو ان تمام المیوں کو اپنے دِل پہ سہتا جاتا ہے اور پھر انہی المیوں اور رویوں کو وہ اپنی تحریروں کے ذریعے باقی کے تمام انسانوں کو دکھاتا ہے۔ ایسے تخلیق کار کو عرفِ عام میں ہم افسانہ نویس یا کہانی کار کہتے ہیں۔ ساجد خان بھی اسی صف کا ایک جینوئن تخلیق کار ہے۔ جو ایک مختصر عرصے میں بطور افسانہ نویس اور کہانی کار اپنی شناخت اور مقام بنا چکا ہے۔ ساجد خان کے مشاہدے کی حس عام لوگوں کی بہ نسبت بہت تیز اور عمیق ہے۔ جو اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتا ہے اور جس زاویے سے دیکھتا ہے وہ اسے اپنے قارئین کے سامنے اسی انداز اور زاویے سے پیش کر دیتا ہے...... اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی نظر آتا ہے۔ کوئی منظر یا واقعہ جب اس کے ذہن کے کینوس پر اترتا ہے تو وہ اسے ردِ عمل کے طور پر کہانی یا افسانے کے روپ میں ڈھال کر پیش کر دیتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل چند لمحوں پر بھی محیط ہو سکتا ہے اور اس میں کئی دن بھی لگ سکتے ہیں۔ ساجد خان نے اس معاملے میں بھی زرخیزی پائی ہے۔ وہ پوری کائنات کے غموں کی شدت کو اپنے اندر محسوس کرنے والا تخلیق کار ہے۔

ساجد خان نے اپنے افسانوں اور کہانیوں میں تمام انسانی رویوں اوران کی باریکیوں کومنظرِ عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کے افسانوں اور کہانیوں کے پلاٹ بناوٹ یا تصنع سے بالکل پاک صاف نظر آتے ہیں۔اس نے اپنے تخلیقی عمل میں کسی بھی نا قابلِ فہم یا دوراز کار باتوں کا سہارا نہیں لیا۔ہر افسانے اور کہانی میں کسی المیے کی طرف اشارہ ہے۔مبالغے سے پرہیز اس کی کہانی اور افسانے کا خاصہ ہے۔ساجد خان کی کہانی یا افسانہ پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ساجد خان کی کہانی یا افسانے کے کردار ہماری آنکھوں کے سامنے متحرک ہیں۔ساجد خان کی مشاہدے اور تجزیے کی حس نے اس کی تحریر کو رواں، شگفتہ اور متحرک بنا دیا ہے۔اس کتاب میں شامل افسانوں میں ساجد خان نے اپنے عہد کے سلگتے المیوں پر قلم اٹھایا ہے۔

ساجد خان کی اس کتاب میں شامل سبھی کہانیاں اپنے پلاٹ، کرداروں اور موضوعات کے حوالے سے انتہائی مضبوط اور جاندار ہیں......ساجد خان کے اسلوب اور طرزِ تحریر کا جامع تأثر تو پوری کتاب پڑھنے کے بعد ہی مکمل ہوتا ہے تاہم میں یہاں پڑھنے والوں کی سہولت کی خاطر کتاب میں شامل تمام افسانوں اور کہانیوں کا تین چار سطری عمومی تجزیہ پیش کرتا ہوں۔

دولت کی ریل پیل نے انسانی زندگی کے تمدن کو گہنا دیا ہے.....ضروریاتِ زندگی کو اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ ان کے حصول کے لئے حقیقی رشتوں کی پہچان تک سے انسان منحرف ہو گیا ہے۔آخری اڑان میں یہی موضوع زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

''آکاش'' افسانے میں دیہاتی کلچر اور محرومیوں کو زیرِ بحث لا کر یہ باور کرایا کہ غربت زدہ معاشرے میں بعض گھروں کے حالات، بچوں کی تعلیم پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور ایسے میں بھی حکومتی نیرو چین کی بانسری بجا رہے ہوتے ہیں۔حالیہ دہشت گردی کی کوکھ سے پھوٹنے والی کہانی ''سومی'' میں ساجد خان نے پہلے اُمید کی تجسیم کی ور پھر ایک زوردار دھماکے نے خواب کو تعبیر کے آس پاس ہی کہیں چکنا چور کر دیا۔

اولاد کے لئے ماں باپ کیا کچھ نہیں کرتے۔اپنی جائز ضرورتوں اور خواہشات کو بھی اپنی اولاد کی

ضرورتوں اور خواہشات پر قربان کر دیتے ہیں۔خوش قسمت ہیں وہ والدین جن کی اولاد ترقی اور تربیت کے اُس معیار تک پہنچ جاتے ہیں جہاں اولاد کو دیکھ کر انہیں سکون نصیب ہوتا ہے۔''اثاثہ'' اسی موضوع پر لکھا گیا ایک خوبصورت افسانہ ہے۔

''اُس پار'' افسانے میں تقسیم کے بعد درپیش مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے......نظریاتی سرحدوں کے علاوہ جغرافیائی سرحدوں کی تقسیم اور پاک بھارت تعلقات میں بدستور کشیدگی کے بطن سے جنم لینے والی اس کہانی میں دو خاندانوں اور ان کی اولادوں تک اِس تقسیم کے اثرات کو منتقل ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں نا جائز طریقوں سے سماجی تعلقات میں اضافے ،اعلیٰ سوسائٹی میں اثر و رسوخ بڑھانے اور حق داروں کا حق مار کر ترقی کرنے کے رُجحان میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔اس دوڑ میں شامل لوگوں کے پاس رشوت اور سفارش کے علاوہ جنس کے حربہ کو بھی مرکزی حیثیت حاصل ہو رہی ہے۔افسانہ''انقلاب'' اسی موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔بیٹی جیسے مقدس رشتے کی مٹھاس اور پھر اس کی جدائی ماں باپ کے لئے موت سے کم نہیں ہوتی۔''بیٹی'' افسانے میں مصنف نے بہت خوبصورتی سے جہاں والدین اور بیٹیوں کے مابین جذباتی وابستگی کو پیش کیا ہے وہاں اولادِ نرینہ سے محرومی میں مشیتِ ایزدی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں ابنارمل لوگوں کے مسائل پر سماجی حلقوں میں اجتماعی طور پر خاص توجہ نہیں دی جاتی ......ایسے لوگ اسی خاندان کا مسئلہ رہتے ہیں جس میں وہ جنم لیتے ہے......بعض بے حس اور مجبور خاندانوں میں بھی رویوں میں تبدیلی اور ایسے افراد پر خاص توجہ نہ دینے کی وجہ سے ایسے افراد گلیوں ،بازاروں اور درگاہوں کے آس پاس دھکے کھاتے ہوئے ملتے ہیں...... جو ہمارے عمومی اور اجتماعی روّیوں پر تھپڑ کی صورت ہماری آنکھوں میں چبھتے رہتے ہیں......حکومتی سطح پر بھی ایسے لوگوں کی فلاح و بہبود پر بننے والے اداروں کی کارکردگی صفر ہے......اسی موضوع پر ساجد خان نے ایک''پاگل'' کی کہانی لکھ کر ہماری اجتماعی سماجی بے حسی کی نشاندہی کی ہے۔

ہماری آنکھوں کے سامنے روزانہ عزتیں نیلام ہوتی ہیں اور آئے دن عزتوں کا بیوپار ہوتا ہے......
لیکن اسی ماحول میں رہنے والے بعض کردار ایسے بھی ہیں جو اپنی عزت وآبرو کے بدلے سب کچھ وان کر کے اسے بچا لیتے ہیں ۔"پانچ کا پینتالیس" افسانے میں گلی گلی پھرنے والی ایک عورت کی کہانی پیش کی گئی ہے جس میں وہ اپنی عزت وآبرو بچانے کی غرض سے اپنے پورے دن کی کمائی ایک اوباش کو دے کر جان بخشی کرواتی ہے۔

"کتے" کی علامت کو افسانہ نگار نے موجودہ عہد کی نام نہاد ترقی پسندی اور اس کے بطن سے جنم لینے والی معاشرتی آلودگیوں کی نقاب کشائی کے لئے استعمال کیا ہے۔تنہائی بذاتِ خود ایک المیہ ہے......تاہم تنہا انسان جب پوری دنیا سے الگ تھلگ ہو کر کچھ سوچتا ہے تو اس کا اندازِ تفکر منفرد ہوتا ہے۔

حکومت اور بیوروکریسی کے درمیان پستی ہوئی عوام بالخصوص ہماری نوجوان نسل جس کرب کا شکار ہے اس کی داستانیں ہم آئے روز میڈیا کے ذریعے دیکھتے اور پڑھتے ہیں ۔افسانہ "جب ان کا جی چاہے گا" میں اسی کرب اور استحصال کی نشاندہی کی گئی ہے۔

بچوں سے مشقت لینے اور بچوں کے بنیادی حقوق کے استحصال کے حوالے سے کتاب میں ایک مضبوط افسانہ "چھوٹا" کے عنوان سے شامل ہے ۔اس افسانے میں مصنف نے بچوں کے اُس دکھ اور کرب کو اپنے دل پر سہا ہے جو چھوٹے چھوٹے معصوم بچے کھلونوں کے بجائے ہمارے معاشرے میں جبری مشقت اور بنیادی حقوق کے استحصال کا شکار ہو کر اٹھاتے ہیں۔

"خدمتِ خلق" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں نام نہاد مسیحاؤں کی رعونت کو انتہائی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔جو ڈگری کے حصول سے پہلے تو خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشاری کا ڈھنڈورہ پیٹتے نہیں تھکتے اور ڈگری مل جانے کے بعد اس جذبے کو محض دکھاوے اور دولت کے حصول کے حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ہر ایک اپنے فلسفے ،تھیوری اور اپنے نظریات کو دوسروں پر بزور ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے۔ہماری

تہذیب کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے۔موجودہ تہذیب خود اپنے خنجر سے خودکشی پر آمادہ نظر آتی ہے۔دنیا آج ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑی ہے۔سب سے تشویشناک بات یہ بھی ہے کہ دنیا میں شرح خواندگی کا تناسب جس تیزی سے بڑھ رہا ہے اتنی ہی تیز رفتاری سے بدامنی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے......''خون'' بھی ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں اس المیے کو انتہائی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔

انسان کی محرومیوں میں سب سے بڑی محرومی بے اولادی ہے اور کبھی کبھی تو یہ ایک طعنہ بن جاتی ہے لیکن کہیں ایسا بھی ہے کہ اولاد ہوتے ہوئے بھی انسان خواہشات کی دہلیز پار نہیں کر سکتا۔افسانہ نگار نے اس حقیقت کو ایک خوبصورت کہانی ''زیست کا قرض'' میں سمویا ہے۔

انسانی اقدار اور رویوں کے زوال اور رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ سے متعلق تخلیق کیا گیا افسانہ ''سبکدوش' پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری بذاتِ خود اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔حق آیا اور باطل مٹ گیا......کیونکہ باطل کو مٹنا ہی تھا......''گھروندہ'' مٹی سے بنے انسانوں اور ان کی خواہشات کی کہانی ہے۔یہ افسانہ پائیداری سے ناپائیداری کا سفر ہے۔اس افسانے میں مصنف نے اس جہانِ رنگ و بو کے دلدادہ اور اس جہانِ فانی کے محبان کے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی ہے۔موبائل فون بیک وقت رحمت اور زحمت کے زمرے میں آتا ہے۔اس کے فوائد اور نقصانات کا انحصار اس کے استعمال پر ہے۔افسانہ''وبالِ جان' کا پلاٹ بھی اسی موضوع سے متعلق ہے۔افسانہ نگار نے نہایت عمدگی کے ساتھ اس کے نقصانات بیان کیے ہیں اور یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ مصنف کو اس کے لئے ایک کہانی کا سہارا لینا پڑا۔

سیاسی دنیا کی بازی گری کے ثمرات سے کون واقف نہیں......عوام کی ملی بھگت اور آشیرباد کے ساتھ سیاست میں منافقت کے در آنے سے جو مسائل اور قباحتیں ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں ان کا بڑی خوبصورتی سے افسانہ ''مٹھائی'' میں پردہ چاک کیا گیا ہے۔اس میں شعوری طور پر عوام کو سیاست کے کھیل اور اس کے درپردہ مقاصد سے آگاہی دلائی گئی ہے۔

”مجھے روشنی چاہئیے“ افسانہ کتاب کا مرکزی اور اہم افسانہ ہے۔اس افسانے میں مصنف نے اس روشنی کی خواہش کی ہے جس کی ہر ایک کو ضرورت ہے۔یہ روشنی ہمیں مذہب،عقیدے اور اعمال پر سختی سے کاربند رہ کر اسی دنیا میں حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے......اچھے سماجی تعلقات اور نیک اعمال کی بدولت روشنی کا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔

سماج کے ہاتھوں عورت کے استحصال کی بدولت موجودہ دور میں صنفِ نازک پر انتہائی برا وقت آیا ہوا ہے جو ہماری اجتماعی معاشرتی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔”مسکراہٹ“ میں مصنف نے عورت کی سماجی حیثیت اور موجودہ عہد میں اس منصب اور رشتے کی بے توقیری کو انتہائی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

توہم پرستی اور اعتقاد کی کمزوری ہمارے معاشرے کا ایک بھیانک اور انتہائی مکروہ المیہ ہے۔توہم پرستی کا شکار انسان ہمیشہ دھوکے اور فریب کا شکار رہتا ہے۔عقیدے کی کمزوری کی بدولت بے شمار انسان دھوکا باز لوگوں کے چنگل میں آ کر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔اسی موضوع پر ساجد خان نے ایک خوبصورت افسانہ”نشانی“تخلیق کیا ہے جس میں دھوکہ بازوں کے ساتھ بعض حکومتی اہلکاروں کی ملی بھگت کو بھی دکھایا گیا ہے۔

نیند کا سفر دراصل ابدی نیند کی طرف بڑھتا ہے۔موت کے بعد انسان کو نیند کی حاجت نہیں رہتی......ساجد خان نے عصرِ حاضر کی بے اطمینانی اور بے سکونی کے شکار ایک انسان کو نیند کی تلاش میں سرگرداں دکھایا ہے......اس افسانے میں ساجد خان نے اس کردار کو احمد فراز کے اس شعر کی عملی تفسیر بنا کر پیش کیا ہے:

نیند تو کیا آئے گی فراز
موت آئی تو سو لیں گے

مجھے روشنی چاہیئے...... ایک تاثر

عمر علی دائم

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ''مجھے روشنی چاہیئے'' میرے ہاتھ میں تھی اور میں ابتدائی صفحات پر صاحب کتاب کے بارے میں معتبر شعراء اور تنقید نگاروں کے تاثرات کے مطالعے میں مصروف تھا۔ بہت سی ادبی شخصیات نے اپنے اپنے انداز میں اُن کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل بحث کی تھی۔ کسی نے اُن کی کہانیوں کے واقعات کو بڑے الاؤ سے اٹھتی چنگاریوں سے منسوب کیا تھا، کوئی ان کے افسانوی موضوعات کے لئے سلگتے کوئلوں کی مثال دے رہا تھا، کسی نے ان کی حقیقت پسندی تو کسی نے ان کے طرزِ تحریر کی تعریف کی۔ کسی کو ان کے زیرِ پا آتشِ خاموش کی موجودگی کا پتہ چلا، کسی نے ان کی تحریر میں زندگی کے تمام رنگ موجود پائے تو کوئی آفاق سے خصوصی طور پر ساجد خان کی فنی عظمت کا اعتراف کرنے آیا۔ غرضیکہ جتنے احباب نے بھی ان تحریروں کو پڑھا انہیں اپنے اپنے حصے کے گوہر نایاب مل گئے۔ ان کے اسلوب، طرزِ تحریر، کردار، پلاٹ، موضوعات اور ہر نقطہ نظر سے ان کے فن اور شخصیت کا تنقیدی جائزہ لیا گیا۔

ایک اچھے افسانے کے لئے اختصار، اسلوب، وحدتِ تاثیر، خیال آفرینی، کرداروں کا آپس میں ربط و ہم آہنگی، وحدتِ زماں اور جزئیات نگاری کی مناسبت کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے اور یہ تمام خوبیاں اللہ تعالٰی نے ساجد خان کو بدرجہ اتم عطا کی ہیں۔ وہ جو بھی تحریر صفحہ قرطاس پر اتارتے ہیں وہ کو دبولتی ہے اور قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کیونکہ ان کی اکثر تحریریں سنتے ہوئے میں کوئی دفعہ سوچوں کی پگڈنڈی پہ بہت دور نکل جاتا ہوں۔

کسی بھی نثری فن پارے پر تنقید کرنے کے لئے بہت سی کتابیں کھنگالنا پڑتی ہیں اور اپنی تمام شعوری صلاحیتیں بروئے کار لانا پڑتی ہیں جو کہ ایک تنقید نگار یا نثر نگار ہی بخوبی کر سکتا ہے جبکہ مجھ جیسے منتشر خیالات اور تخیلاتی دنیا میں رہنے والے شخص کے لئے ساجد خان جیسے تخلیق کار کے فن پر بحث کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ خیر میں اُسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ نجانے کب

میری آنکھ لگ گئی اور میں نے کو دکو ایک ایسی جگہ پایا جہاں ہر طرف ظلم و نا انصافی، قتل و غارت، لوٹ مار، کرپشن، رشوت، سفارش، اقربا پروری، دہشت گردی اور استحصال کا راج تھا۔ ہر ایک شخص اپنے مفاد کی خاطر دوسرے کا گلا کاٹ رہا تھا۔ ہر طرف افراتفری، بے چینی اور انتشار کا دور دورہ تھا اور پوری فضا مایوسی اور نا امیدی کی دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ اسی افراتفری اور بھیڑ میں مجھے فراخ پیشانی، روشن آنکھوں اور مسکراتے چہرے والا ایک شخص نظر آیا۔ جو سب میں موجود ہوتے ہوئے بھی سب سے الگ نظر آیا اور میں اس کی طرف چل دیا۔ مجھے اپنی جانب آتا دیکھ کر اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور میں بلا اجازت ہی اس کے پاس بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا ...... جناب آپ کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟ لیکن وہ بالکل خاموش میری طرف دیکھے اور مسکرائے جا رہا تھا۔ شاید وہ اپنی مسکراہٹ کے پیچھے اس کرب کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا جو کہ اس کے چہرے سے نمایاں تھا۔ اچانک میری نظر اس کے دامن پر پڑی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے دامن میں کیا ہے؟ تو کہنے لگا میری زندگی کا اثاثہ!

میں نے دامن کے اندر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ ہر حال میں مجھ سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں بدستور دیکھنے پر بضد تھا۔ آخر کار میرے بار بار اصرار پر اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا دامن میرے سامنے کھول دیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا دامن سارے جہاں کے دکھوں سے بھرا پڑا تھا ...... غربت و استحصال کا دکھ، حقوق انسانی کی غیر منصفانہ تقسیم کا دکھ، جبری مشقت کا دکھ، پردیس کا دکھ، معاشرے کی بے حسی کا دکھ، غیروں کی اندھی تقلید کا دکھ، دم توڑتی تہذیب و ثقافت کا دکھ اقربا پروری، بدامنی اور قتل و غارت کا دکھ...... کون سا دکھ ہوگا جو اس کے دامن میں موجود نہیں تھا؟

میں اس کی جھولی میں اتنے سارے دکھ درد دیکھ کر نم دیدہ ہو گیا اور اس سے پوچھا کہ آخر آپ نے زمانے بھر کے دکھ اپنی جھولی میں کیوں ڈال رکھے ہیں؟ ...... وہ بولا کہ یہ زمانے کے نہیں میرے

اپنے دکھ ہیں کیونکہ یہ معاشرہ، یہ لوگ اور یہ ملک میرا اپنا ہے اور ان کے تمام دکھ میرے اپنے ہیں اور جب تک میری سانس چلتی رہے گی اور جہاں تک ممکن ہو سکا میں یہ دکھ درد اپنے دامن میں سمیٹتا اور آوازِ حق بلند کرتا رہوں گا۔ مجھے اس کی ہمت، حوصلے اور خلوص کی داد دینا پڑی...... مجھے رنجیدہ دیکھ کر وہ بولا ...... میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ میرا دامن دیکھنے کی ضدمت کرو؟ لیکن تم نہیں مانے۔ تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ...... یہ میرے دکھ ہیں اور میں خود ہی ان کا علاج بھی تلاش کروں گا۔ نجانے کیوں اس کے پاس سے اٹھنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے اس کے چہرے سے عجیب سی اپنائیت نظر آ رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے میری اس سے برسوں کی جان پہچان ہے۔ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا اور خواب میں پیش آنے والے واقعات کی کڑی سے کڑی ملانے لگا...... تھوڑی دیر میں ہی میری آنکھوں کے سامنے ایک تحریر کا عکس بنتا گیا اور آخری کڑی ملتے ہی جو تحریر میرے سامنے آئی .... وہ......وہ...... "مجھے روشنی چاہیے" تھی ......اور اس کے بعد جو پیکر ڈھلا وہ "ساجد خان" تھا۔

(علامہ مشرقی فاؤنڈیشن حویلیاں کے زیرِ اہتمام تقریب رونمائی میں پڑھا گیا ......۱۵ جون ۲۰۱۱ء)

ساجد خان ...... ہزارہ کا ایک ابھرتا ہوا افسانہ نویس

پروفیسر بشیر احمد سوز

انسان نے جونہی عالمِ ہست وبود میں قدم رکھا کہانیوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آدم کی تخلیق کے ساتھ ہی کہانی وجود میں آ گئی پھر آسمانوں سے زمیں پر اتر آئی۔ یوں کہانیوں کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ حیاتِ انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ کہانیوں کے کرواں چلتے رہے۔ زندگی جوں جوں کروٹیں لیتی ہے ہزاروں لاکھوں کہانیوں کو جنم دیتی آگے کو بڑھتی چلی جاتی ہے۔ خوشی اور غم کے بے کنار سمندروں کے آس پاس کہانیاں خودرو پودوں کی مانند اگتی چلی جاتی ہیں۔ غرضیکہ ہر نفس میں ایک کہانی موجود ہے کیونکہ زندگی خود ایک کہانی ہے جس سے لحظہ بہ لحظہ کہانیاں چنگاریوں کی صورت پھوٹتی ہیں جو کبھی تو خاروخس اور نیستاں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہیں اور کبھی چاندنی کی مانند روشنی اور ٹھنڈک بن کر انسانوں کو امید کی کوشیاں اور آگے بڑھنے کے احساس کے ساتھ تابندگی عطا کرتی ہیں۔ کہانی وہی سچی ہوتی ہے جو انسان کو انسان کی آنکھ سے دیکھنے کے قابل بناتی ہے جو انسان کے احساسات اور جذبات کی ترجمان ہو، جو انسانوں کی خوشیوں اور غموں سے مرتب ہو، جو انسانوں کے مسائل کے قریں ہو اور جسے پڑھ کر انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھی۔

زندگی کھلی کتاب کی مانند ہے اس کے ورق ورق پر کہانیاں رقم ہیں مگر وہ جو دل کی آنکھ سے ان کہانیوں کو پڑھنے کا ہنر جانتا ہے وہی ان سے نئی کہانیوں کے لئے مواد حاصل کر سکتا ہے۔ گویا حساسیت فن کی تخلیق کا باعث بنتی ہے خواہ کہانی کی صورت میں جلوہ ریز ہو یا نغمۂ موسیقی کے سانچے میں ڈھلنے لگے۔ فنونِ لطیفہ کی اساس ہی دراصل حساسیت ہے۔ جس فنکار کے حصے میں جتنی حساسیت آتی ہے وہ اپنے فن پارے میں اُتنے ہی حسین رنگ بھرتا ہے۔ ورنہ بقول میرؔ:

سرسری تم جہان سے گزرے　　　ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

کے مصداق زندگی کے جلال و جمال اور حسن و قبح سے بے بہرہ شام و سحر کے گرداب میں بہتے ہی

چلے جاتے ہیں جس طرح خس وخاشاک اور شجر وحجر حالات کے رحم وکرم پر اپنے وجود کو ریزہ ریزہ کرتے بالآخر اپنا وجود کھو دیتے ہیں۔ اور جو شعور وادراک اور احساس کی چقماق سے شرر پیدا کرنے کی ذراسی بھی صلاحیت رکھتے ہیں وہ زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں سے سوسو انداز میں سوسو رنگ اٹھا لیتے ہیں۔ یہیں سے تخلیق کا عمل شروع ہوتا ہے اور اس تخلیق میں انسان تصویر نما نہیں ہوتے بلکہ ہنستے، روتے، چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اور جو فنکار اپنے فن میں ان کو متحرک کر دیتا ہے وہی سچا اور حقیقت پسند فنکار کہلاتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے وہ فن کار کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔

فن اور فنکار کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے قطعاً یہ تأثر نہ لیا جائے کہ میں ساجد خان کی کہانیوں کو زندہ ادب کی مثال بنا کر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ساجد خان ابھی نومشق اور جواں سال کہانی نویس ہے۔ ابھی وہ ادب کے چوراہے پہ کھڑا ہے جہاں سے وہ اپنے لئے اس رستے کے تعین میں غلطاں جو اُسے صحیح منزل کی جانب لے جائے۔ ساجد خان کی یہی کاوش اُسے آئندہ برسوں میں اُس مقام پہ لے جائے گی جہاں سے زندہ ادب کی راہیں زیادہ واضح ہوتی چلی جائیں گی۔ یقینِ کامل ہے کہ اُس کی ریاضت اُس کے فن کو جلا بخشتی رہے گی اور وہ جلد افسانوی ادب میں ایک معروف افسانہ نگار کے طور پہ جلوہ گر ہوگا۔

ساجد خان کہانی لکھنے کی تکنیک سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مختصر ترین کہانی کا تأثر کیسے قائم رکھا جا سکتا ہے۔ وہ افسانہ لکھنے کے اسلوب سے آشنا ہے اور زبان وبیان پر گرفت رکھتا ہے۔ واقعات کا گورکھ دھندہ نہیں بناتا اور نہ کہانی کے تانے بانوں میں اُسے الجھا دیتا ہے۔ وہ اپنے مختصر افسانوں میں ایک دو واقعات لانے پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سیدھے اور سپاٹ انداز میں کہانی پیش کر دیتا ہے۔ کہانی ابتداء سے آخر تک بغیر کسی الجھاؤ کے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ البتہ کہانی کے اختتامی جملوں میں نہایت ڈرامائی انداز سے مرکزی خیال کو لے آتا ہے جو پوری کہانی کے تأثر کو دوچند کر دیتے ہیں۔ معنویت اور مقصدیت جب تأثراتی جملوں میں

ڈھل کر کہانی کے نقطۂ عروج میں جھلکنے لگتی ہے تو قاری بلا تامل یہ کہہ اٹھتا ہے کہ ساجد خان ایک بالغ نظر افسانہ نگار ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے اُس کی نومشقی کو بھلا بیٹھتا ہے اور حرفِ تحسین کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں بچتا۔

ساجد خان زمینی حقائق اور انسانی مسائل کا نمائندہ قلمکار ہے۔ وہ زندہ دلوں کی باتیں زندہ لوگوں سے کرتا ہے جن میں درد و کرب بھی ہے اور رجائیت کے عناصر بھی موجود ہیں۔ اس کی کہانیوں میں زندگی کے تجربات بولتے نظر آتے ہیں۔ اس کی کہانیاں پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے اطراف کے جھونپڑوں اور گھروندوں کے کواڑوں میں جھانک جھانک کر انسانوں کے تلخ و شیریں واقعات کو اپنی آنکھوں میں بھر لیتا ہے اور پھر انہیں نہایت چابکدستی اور پُرکاری کے ساتھ نوکِ قلم سے اوراق پر بکھیر دیتا ہے۔ گویا مشاہدے کی گہرائی اور گیرائی اس کی کہانیوں کا اصل سرمایہ ہے۔
ساجد خان کے افسانوں میں زبان و بیان اور روزمرہ محاورے کے کمزور پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں جو غائر مطالعے سے ہی گرفت میں آ سکتے ہیں۔ ساجد خان کے ہاں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور ان میں جیتی جاگتی زندگی کے عکس بھی ہیں۔

(علامہ مشرقی فاؤنڈیشن حویلیاں کے زیرِ اہتمام تقریبِ رونمائی میں پڑھا گیا ......۱۵ جون ۲۰۱۱ء)

مجھے روشنی چاہیئے......ایک مطالعہ

خداداد خالد

کہانی کا آغاز دراصل ابن آدم کی تخلیق کے ساتھ ہی ہوا ہے۔ جب بھی دو یا دو سے زائد انسان آپس میں ملتے ہیں تو ان کے درمیان روزمرہ کے حالات وواقعات پر خیالات کا تبادلہ ضرور ہوتا ہے۔یہی خیالات کا میل جول جب آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تو کہانی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔یہ بات بہت اہم ہے کہ کہانی بیان کرنے والا شخص کیسا ہے؟اس کی شخصیت کا معاشرے میں کیا معیار ہے؟ کیا وہ شخص دیانت دار ہے، صاف گو ہے؟ ہم کہانی بیان کرنے والے شخص کی ذات کو علیحدہ کر کے کہانی کو سمجھ نہیں سکتے۔ساجد خان کی شخصیت آئینے کی طرح شفاف اور واضح ہے۔وہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ ہمارے ہاں تو بس اندھیروں کا کاروبار ہوتا ہے جب یہ کہتا ہے کہ" مجھے روشنی چاہیئے'' تو اسے یہ بھی معلوم ہے کہ ظاہری روشنی کی طلب وقتی ضرورتوں کے لئے ہوتی ہے لیکن ساجد خان تو باطنی روشنی کا طلبگار ہے۔"مجھے روشنی چاہیئے''میں ہمارے گردوپیش میں پھیلے ہوئے ایسے مسائل کی روداد ہے جو شب وروز انسانیت کو اندھیروں کی جانب دھکیل رہے ہیں ......مردہ ضمیروں کی دنیا میں زندگی کا حسن تلاش کرنے کی کوشش میں ساجد خان نے اپنے قلم کو وسیلہ بنایا ہے۔قلم ایک ایسی طاقت ہے جس کے مثبت استعمال سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں اور افراد اپنے گردوپیش کو سجانے اور سنوارنے میں جت جاتے ہیں۔ساجد خان نے اپنے افسانوں میں خود احتسابی اور انسانوں میں مساوات کی سطح پر وسائل کی تقسیم کا درس دیا ہے۔جس کی مثال انقلاب، پانچ کا پینتالیس، کتے، نشانی اور جب ان کا جی چاہے گا...... جیسے افسانے پڑھ کر دی جا سکتی ہے۔آکاش کا موضوع اگر چہ غربت ہے لیکن اس افسانے کے کردار" آکاش'' کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بچوں میں علم حاصل کرنیکی تڑپ اور لگن کا بھی پتہ چلتا ہے۔میں ساجد خان کو اس مجموعے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(قلم کارواں حویلیاں کے زیر اہتمام تقریب رونمائی ......۱۹ جون ۲۰۱۱ء)

ساجد خان کی شخصیت اور فن

فرحان انجم

تمام تعریف اس رَبّ کے لئے جس نے انسان کو قلم کی طاقت عطا کی، اسے شعور بخشا، اسے نطق و بیان کا ہنر اور الفاظ و جذبات کا ادراک عطا کیا۔ حرف کی حرمت سے ایک عالم منور ہے۔ حروف کے ذریعے ہی ابنِ آدم کی تہذیب اور انسانیت کے آئین کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ سچے اور کھرے جذبوں کی حرارت جب فکر و خیال کی روشنیوں کے رنگ نکھارتی ہے تو الفاظ الہام کی طرح ذہنی حجابوں سے اُدھر پوشیدہ حقیقتوں کا سراغ لگاتے ہیں اور یہی الفاظ محسوسات کے افق سے پرے مدفون لاشعوری ادراک اور اسرار کا پتہ بتاتے ہیں۔ جب تک صاحبِ نطق و بیان لفظوں کے مزاج سے واقف نہ ہو جذبہ و خیال کے بے کراں صحراؤں میں دور تک پھیلے ہوئے وہم کے اندھیروں میں راستہ بھٹک کر اپنے وجود کے نشانات تک بھلا بیٹھتا ہے اور وہ بے خبری کے داغ اپنی بصیرت کے اُجلے پیراہن پر سجاتا رہتا ہے۔

لفظ انسانی تہذیب کا سرمایہ بھی ہیں اور اس کے فکری نظریات کی پہچان بھی۔ لفظ ہماری ذات کے ادراک کا مؤثر ترین ذریعہ بھی ہیں اور محسوسات کے اظہار کا توانا ترین وسیلہ بھی۔ اگر لفظ اپنے اندر حرمت نہ رکھتے تو لوگ کبھی قبروں کی پیشانیوں پر لفظوں سے اٹے کتبے نہ سجاتے۔

جنابِ من! جب تخلیق کا عمل جنم لیتا ہے تو ہولے ہولے مستی کے حجابات سرکنے لگتے ہیں۔ دھیرے دھیرے تخلیق کا آنچل ڈھلنے لگتا ہے۔ احساسات کے بادل رِم جھم برسنے لگتے ہیں۔ محسوسات کے پرتو آب و تاب سے جلوہ فگن ہونے لگتے ہیں۔ پیکرِ عالم کی رگوں میں ہلچل سی ہونے لگتی ہے۔ آفاق کے سینے میں کرنیں دھڑکنے لگتی ہیں اور شیرازہ کن ڈھلنے لگتا ہے۔ فیکون میں اور ہر سمت وجدان کی کرنیں بکھرنے لگتی ہیں۔

جب کئی تخلیق خوبصورت لفظوں کا پیراہن اوڑھ کر اپنی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ ہستی پہ ظہور پذیر ہوتی ہے تو اس کا نام کبھی کہانی، کبھی افسانہ، کبھی گیت، کبھی غزل، کبھی شعر کبھی ناول اور کبھی

طنز ومزاح جنم لیتا ہے۔انسان کا کہانی سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ہر انسان کئی ایک کہانیوں کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔یہ کہانی کار کا کمال ہے کہ وہ ہم سب سے وابستہ کہانیوں کو کیسے اور کس انداز میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا ہے اور کہانی جب خاص قسم کے ادبی ماحول میں نمو پاتی ہے تو افسانہ کہلاتی ہے۔فنکار کا کمال فن سے بڑا ہے کیونکہ اگر فنکار زندہ ہے تو زندہ ادب تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔میں ساجد خان کو ایک زندہ فنکار کہوں گا کیونکہ ان کی تحریر زندگی متحرک نظر آتی ہے۔ انہیں اپنی کہانی کی تلاش میں کہیں دور جانا نہیں پڑتا۔وہ اپنے گردوپیش بکھرے ہوئے موضوعات کو اپنے اندر سمو کر اپنے گردوپیش سے ہی کہانی تخلیق کرتا ہے۔چونکہ ساجد خان کا تعلق عوام سے ہے اور ان کی تحریروں کا تعلق بھی عوام سے ہی ہے۔یوں ان کے قول و فعل تحریروں اور طرزِ زندگی میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ان کا قلم ہمارے معاشرے کی سفاکیوں سے بغیر کسی تکلف کے پردہ چاک کرتا نظر آتا ہے۔درحقیقت صداقت ہی خیر کا نام ہے اور بددیانتی سراسر شر ہے۔ان کی کہانی میری کہانی ہے اور آپ سب کی بھی۔ان کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کو ہمارے اردگرد پھیلی تلخ سچائیوں کو بغیر کسی لگی لپٹی کے اوراق کی زینت بناتے ہیں۔ اگر کسی کو گلہ ہے کہ ان کی تحریروں میں جمالیات کی چاشنی کم ہے اور معاشرے کی سفاکی اور ہولناکی کے موضوعات زیادہ ہیں تو اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ ہم جس معاشرے میں، جس دنیا میں رہ رہے ہیں اس پر ہی ایک نظر ڈالی جائے ......بقول شاعر:

امیرِ شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے　　　　کبھی بہ حیلۂ مذہب، کبھی بنامِ وطن

ساجد خان کی فکر ان کے فن پر حاوی ہے اور ان کا فن فکر کے تابع ہے۔وہ اپنی فکر کے چاک پر لفظوں کو گھماتے ہیں تو وہ افسانے کا روپ دھار لیتے ہیں۔ان کے ہاں شعور اور لاشعور کی ہم آہنگی اور فکر وتخیل کا توازن نظر آتا ہے۔اس خوبصورت کتاب کی تخلیق پر میں ساجد خان کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں۔

(قلم کارواں حویلیاں کے زیرِ اہتمام تقریبِ رونمائی ......۱۹ جون ۲۰۱۱ء)

چانن مینوں چاہی دا (پنجابی)

میاں محمد اعظم

ساجد خاں نے لکھ افسانے لوکاں نوں سمجھایا اے
ملک اساڈے وچ رولا رہندا خلقت شور مچایا اے

بم دھماکے، قتل و غارت نالے وحشت گردی اے
ایہ معمول ہویا نیں ایتھے روز پئی خلقت مردی اے

ہوندی پئی کرپشن ایتھے نالے رشوت خوری اے
شہراں دے وچ ڈاکے پیندے، پنڈاں دے وچ چوری اے

کوئی پئے لوکی عیش کریندے، کوئی پئے دکھ اٹھاندے نیں
کوئی کاراں تے سیر کریندے کوئی پئے ٹروے جاندے نیں

پڑھے لکھے پئے دھکے کھاندے جہڑے غربت مارے نیں
ہر تھاں چلے پیسہ رشوت اوہ تاں تھکے ہارے نیں

نہیں خدا دا خوف اونہاں نوں جیہڑے ظلم کماندے نیں
ایہ وطیرہ بنیا اونہاں ذرا شرم نہیں کھاندے نیں

لکھ کے چوی(۲۴) افسانے ساجد اک کتاب بنائی اے
"چانن مینوں چاہی دا" اوہدی ایہ دُہائی اے

کدھرے ساجد خاں پیا یارو عشق دی گل سناندا اے
چسکے لے کے شروع کریندا ، پچھوں پڑدے پاوندا اے

حال گھڑی دیاں لکھ کے گلاں اوہنے سچ سنایا اے
جو کجھ ہو رہیا اے اجکل، شیشہ سب وکھایا اے

گل چھوٹی تے مطلب وڈا، اوہدی اہ کہانی اے
طور طریقے نال ایہ سارے لوکاں نوں سمجھائی اے

ساجد خان نے عقل دوڑا کے گلاں اہ بنائیاں نیں
"ہری پور" تو اُگے اعظم فیر "حویلیاں" آئیاں نیں

(حرف اکادمی پاکستان راولپنڈی کے زیر اہتمام تقریب رونمائی ...... ۲۵ جون ۲۰۱۱ء)

جویائے نور......ساجد خان

جاوید اقبال راجا

تیرگی ہے، تاریکی ہے، گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے......ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، کھلی آنکھوں سے بھی دکھائی نہیں دیتا، اُمید کا کوئی جگنو تک ٹمٹماتا نہیں۔معاشرے کی ساری کرنیں گہرے پانیوں میں اتر گئی ہیں۔یا اللہ! ہم کس اندھیری رات کے مسافر ہیں کہ جہاں ہر شخص دہائی دیتا پھر رہا ہے...... "مجھے روشنی چاہیئے"......"مجھے زندگی چاہیئے"۔

ساجد خان کی کتاب "مجھے روشنی چاہیئے" ہر دل کی آواز ہے۔اس کے ہر افسانے نے معاشرے کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔جہاں افلاس کے اندھیرے ہیں۔فرد کی تنہائیوں کا کرب ہے۔رشتوں کے تصادم سے پیدا ہونے والی آوازوں کا شور ہے اور انگڑائیاں لیتی آرزوؤں اور تمناؤں کا ٹھہراؤ ہے۔ساجد خان کا ہر افسانہ تجرید سے تجسیم اور تخیل سے حقیقت کا سفر خراماں خراماں طے کرتا ہے۔ہر افسانہ زندگی کے قریب ہے۔ہر افسانے کے کردار دیکھے بھالے اور اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔ان کے افسانے "آکاش" میں دیہاتی کلچر ہو یا "اُس پار" میں تقسیم کے مسائل ہوں۔"پاگل" میں معاشرتی بے حسی کا رنج ہو یا "چھوٹا" میں معصوم بچے کا روٹی کے حصول کا المیہ ہو......سب افسانے معاشرے کا چہرہ ہیں جس پر بہت گرد پڑ چکی ہے۔تاریکی ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور اگر روشنی نام کی کوئی چنگاری ہے بھی تو وہ سراب ہے۔ساجد کا ہر افسانہ پیغام دیتا ہے کہ:

فریب وقت نے گہرا حجاب ڈالا ہے
وہاں بھی شمع جلا دو جہاں اُجالا ہے

"مجھے روشنی چاہیے" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں زندہ رہنے کی آرزو بدرجہ اتم موجود ہے۔آدمی کسی صورت مرنا نہیں چاہتا۔آدمی کبھی نہیں مرنا چاہئے۔زندہ وہ رہتے ہیں جن کی قبر تک جانے والی پگڈنڈی پر گھاس نہیں اُگتی۔

ساجد خان! میں آپ کی حوصلہ شکنی نہیں کر رہا مگر افسوس سے کہتا ہوں کہ آپ کی یہ کتاب ادب عالیہ

میں شمار نہیں ہوگی اور نہ ہی اسے کوئی ایوارڈ ملے گا۔ پوچھیں کیوں؟ اس کی خامی یہ ہے کہ یہ کتاب ہر پڑھنے والا سمجھ لیتا ہے۔ بڑی کتاب وہ ہوتی ہے جس سے پتا ہی نہ چلے کہ کہنے والا کیا کہہ گیا ہے۔ بڑی کتاب وہ ہوتی ہے جس میں فلسفیانہ موشگافیاں ہوں، پیچ وخم کھاتی، مفہوم ومعنی سے دامن بچاتی اور عام رویّوں کو جھٹلاتی بھاری بھرکم ذومعنی باتیں ہوں۔ آپ کی کتاب سمجھ میں آجاتی ہے۔ اسے پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ دل میں ٹیس اٹھتی ہے۔ بڑی کتاب وہ ہوتی ہے جسے بندہ پڑھ کر دورا ہے پر کھڑا ہو جائے میں ہنسوں یا روؤں؟

میں اپنا ذاتی تجربہ سناتا ہوں۔ عبداللہ حسین کی ''اداس نسلیں'' اور بانو قدسیہ کی ''راجہ گدھ'' میں نے ادیبوں اور تبصرہ نگاروں کی آرا سے متاثر ہوکر بڑے چاؤ سے اپنی جیبِ خاص سے خریدیں۔ پڑھنا شروع کیا۔ کچھ سمجھ نہ آئی۔ چند صفحات پڑھنے کا نتیجہ صفر، پھر آغاز سے پڑھنا شروع کیا۔ وہی ڈھاک کے تین پات ......یا اللہ! یہ کیا ہے؟ مزید پڑھنے کی ہمت نہ رہی۔ ادیب قسم کے دوستوں سے بات کی۔ کہنے لگے تیرا دماغ چھوٹا ہے، اس میں بڑی بات نہیں آسکتی۔ پوری کتاب پڑھو۔ میں نے سوچا، یار پیسے لگائے ہیں، پڑھنا چاہیے۔ جی کڑا کر کے، دل پر پتھر رکھ کے دونوں کتابیں الف سے یے تک پڑھ ڈالیں۔ اگر آپ میری کم فہمی کا ڈھنڈورا نہ پیٹیں اور راز، راز ہی رکھیں تو میں پوری دیانت داری سے اعترافِ حقیقت کرتا ہوں کہ میرے پلے کچھ نہیں پڑا......شاید میرا وہ فیلڈ ہی نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ تھا کہ لوگ مجھے پڑھا لکھا آدمی سمجھتے ہیں۔ اردو کا استاد مانتے ہیں اور میں ہوں کہ اس دور کی سب سے بلند ادبی شاہکار کتابوں کو سمجھ ہی نہیں سکا۔ پھر بلی کے بھاگوں چھینکا یوں ٹوٹا کہ عطاالحق قاسمی نے اپنے کالم میں ان دونوں کتب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ پتا نہیں لوگ یہ کتابیں کس طرح پڑھ لیتے ہیں؟ ...... ''وہ مارا'' ...... میں خوشی سے اُچھلا۔ قینچی ڈھونڈی، کالم کاٹا اور ''راجہ گدھ'' کے آخری صفحے پر چسپاں کر دیا۔ اب ہوگا یہ کہ جب میرے جیسا چھوٹے ذہن کا آدمی یہ کتاب ہمت کر کے پوری پڑھ لے گا تو اس کی جبینِ نیاز، عرقِ ندامت سے تر نہ ہوگی۔

خواتین وحضرات! برسوں پہلے پطرس بخاری اپنے مضمون ''میں اور میبل'' میں مجرب نسخہ بتا گئے ہیں کہ کتاب کا مطالعہ کئے بغیر کتاب پر سیر حاصل تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تجربے کی کمی کی بنا پر نوآموز اور نوجوان ادیب کتاب سونگھ کر یا مصنف کا سراپا دیکھ کر کتاب پر تبصرہ نہیں کر سکتا۔ یہی حال میرے ساتھ ہوا ہے۔ مجھے ساری کتاب پڑھنا پڑی۔ ابھی لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون جاننا میری دانش سے ماورا ہے۔ اس لئے:

در گذر فرما میری گستاخیاں پیرِ مغاں
آتے آتے آئیں گے آدابِ میخانہ مجھے

''مجھے روشنی چاہئے'' میں کوئی افسانہ ایسا نہیں ہے کہ جسے پڑھ کے بندہ کہے ''عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی'' ۔ساری باتیں، ہماری باتیں ہیں۔ ساجد خان صاحب کو میں مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے ایک خوبصورت کتاب تصنیف کی ہے۔ ان کے قلم میں روانی ہے۔ بات کر جانا جانتے ہیں۔ ان کا کوئی افسانہ پڑھ کے میرا منہ کھلے کا کھلا نہیں رہ گیا کہ یا اللہ! انہوں نے کہا کیا ہے؟ کس بات کو کہاں جا کے ملایا ہے؟ مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے کہ ایک استاد نے کلاس سے پوچھا...... ''اگر راولپنڈی سے اسلام آباد کا فاصلہ دس کلومیٹر ہو تو بتاؤ میری عمر کیا ہے؟ ...... بچوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے کہ استاد کیا پوچھ رہے ہیں۔ فاصلے کا عمر سے کیا تعلق؟

آخر ایک بچے نے ہاتھ کھڑا کیا۔

استاد نے کہا...... ''ہاں بیٹا! بتاؤ میری عمر کتنی ہے؟''

''سر آپ کی عمر پچاس سال ہے'' ...... بچے نے جواب دیا۔

اتفاق سے استاد صاحب کی عمر پچاس سال ہی تھی۔ وہ خوش ہوئے۔ بولے......

''تم نے یہ سوال کیسے حل کیا ہے؟''

''سر میرے بڑے بھائی کی عمر پچیس سال ہے اور وہ آدھا پاگل ہے'' ...... شاگرد بولا۔

(حرف اکادمی پاکستان راولپنڈی کے زیرِ اہتمام تقریبِ رونمائی ...... ۲۵ جون ۲۰۱۱ء)

افسانے خان کے

فرخندہ شمیم

''ساجد خان'' کی کاوش ''مجھے روشنی چاہیئے'' جب میں نے پڑھی تو یہ سچائی اور بھی تیقن کے ساتھ روح نواز ہوگئی کہ انسان کسی بھی کہکشاں میں چلا جائے اور سینۂ افلاک کو کتنا ہی چھان پھٹک لے، مٹی اور اس سے جڑے رشتے اُسے ایسے ہی کھینچتے ہیں جیسے کششِ ثقل تمام اہلِ پرواز کو زمین پر لے آتی ہے کہ بقائے زیست کے لئے رزق اُنہیں زمین پر ہی ملتا ہے:

چاند پہ جا رہا ہے کیوں انساں
اس زمیں کا تو حق ادا نہ ہوا

''مجھے روشنی چاہیئے'' اپنے سادہ گیٹ اَپ میں اُس دوشیزہ کی طرح ہے جو بالکل عام سے لباس میں بھی دلکش ور نظر آتی ہے۔یہ وہ لڑکی ہے جسے بات کرنا آتی ہے، اُسے سمجھنا آتا ہے اور سب سے بڑھ کر اُسے سہنا آتا ہے۔افسانہ نگار نے اس تصنیف میں بہت کچھ سہا ہے۔وہ چاہے ''آخری اُڑان'' کا وسیم ہو یا ''آکاش'' کا آکاش، ''اُس پار'' کے کردار ہوں یا ''زیست کا قرض'' کے مرکزی کردار...... یہ سب کچھ سہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔معاشرتی ناہمواریوں کا دُکھ، عزتِ نفس کی بربادی کا نوحہ، نام نہاد شرفاء کے نعرے اور تقدیر سے گلہ کرتی ہوئی آہیں......موضوعات کی ایک لڑی ہے جسے دانہ دانہ پرو دیا گیا ہے۔

ساجد خان کے افسانے جزئیات نگاری اور منظر کشی کی اچھی مثال ہیں۔کہانیوں کا حدود اربع مختصر ہے لیکن اس اختصار میں کہانی کا گھروندہ اچھی طرح بنا ہوا ہے۔وہ گاؤں کی فضاء کا قصہ ہو تو تازہ ہواؤں، پگڈنڈیوں، ندیوں اور پرندوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور شہر کی مصنوعی سج دھج دکھانی ہو تو ''انقلاب'' نامی افسانہ لکھ جاتے ہیں۔ہر دو صورت میں ساجد خان کا اسلوب پراسرار محلات کی بجائے کھلی حویلی میں کھلتا ہے جہاں غلام گردشوں کے بھنور نہیں ہوتے۔

کتاب ''مجھے روشنی چاہیئے'' کسی لمبے چوڑے فلسفے پر بھی بنیاد نہیں کرتی تاہم ان افسانوں کے کئی

جملے کسی علامتی direction کی طرف توجہ مبذول کراتے محسوس ہوتے ہیں۔چند جملے ملاحظہ کیجئے:

''وہ بھی سوچتا ہوگا آتا کھاتے تو خود ہیں اور اٹھواتے مجھ سے ہیں''۔

مٹی جیسے بنیادی عنصرِ تخلیق کی تشریح اس جملے میں افسانہ نگار اس طرح کرتے ہیں:

''جہاں میں بیٹھا ہوں یہ دوسری دنیا ہے۔اس دنیا میں اوپر بھی مٹی، نیچے بھی مٹی، اطراف میں بھی مٹی اور مٹی میں ایک اور مٹی''۔

''اب مدتیں گذر چکی ہیں۔میری بیٹی اور بیٹا نجانے کہاں ہیں؟ وہ دیا لے کر نہیں لوٹے،میرے اڑوس پڑوس میں جب کبھی دیا جلایا جاتا ہے تو روشنی کی ہلکی سی رمق میری طرف بھی آتی ہے اور میں اپنی قبر میں چلاّ تا رہتا ہوں''مجھے روشنی چاہیئے''......''مجھے روشنی چاہیئے''۔

ساجد خان کے افسانوں میں جوتا ایک علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔اس نے اپنے افسانوں'' آکاش''اور''اثاثہ''میں جوتے کو نظریات اور نیتوں کے حوالے سے دیکھا اور personify کیا ہے۔ان کے نزدیک جوتا قدموں کا اعتماد ہوتا ہے لیکن اس کے لئے اس کا قیمتی اور خوشنما ہونا ضروری نہیں۔

''مجھے روشنی چاہیئے''ایک ایسی تصنیف ہے جس میں افسانے کے کئی لوازمات موجود ہیں لیکن یہ ایک ہٹیلی سچائی ہے کہ افسانہ نگاری ایک عجیب وغریب صنف ہے اگر عام سے انداز میں لکھا جائے تو بچوں کی کہانی لگتی ہے۔زیادہ لوازمات سے آراستہ کیا جائے تو فقط لفظی حسن کا مرقع بن جاتی ہے۔اِسے فلسفیانہ رنگ دیا جائے تو خواہ مخواہ مشکل اور غیر دلچسپ ہوجاتی ہے۔دراصل یہ ایک کٹھن صنف ہے جسے بڑے لاڈ اور حکمتِ عملی کے ساتھ برتنا پڑتا ہے ورنہ یہ اپنی جاذبیت کم کردیتی ہے اور روٹھ جاتی ہے۔''مجھے روشنی چاہیئے''کے مصنف نے افسانوں میں خطابت اور صحافیانہ رنگ کی آمیزش کرکے کہیں کہیں افسانے کو ناراض بھی کیا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ قلمکار قارئین کے اس الزام سے لاشعوری طور پر بچنا چاہتا ہے کہ کہانی ابلاغ کرنے میں سرخرو نہیں ہوئی۔افسانہ نگار خواہ

سینئر ہو جا جونیئر مطالعے کے بغیر نا سمجھ ہوتا ہے۔ ساجد خان چونکہ لکھنا جانتے ہیں اس لئے یقیناً پڑھنا بھی جانتے ہوں گے...... ویسے بھی دنیا بجائے خود ایک بڑی کہکشاں ہے اور ہنر برتنے کا ہنر مصنف کی مزید محنت سے نکھرنے کا امکان لئے ہوئے ہے۔

میں اس کاوش پر ساجد خان کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

(حرف اکادمی پاکستان راولپنڈی کے زیر اہتمام تقریبِ رونمائی...... ۲۵ جون ۲۰۱۱ء)

روشنی کا متلاشی ایک شخص

نعیم اکرم قریشی

اندھیرا کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو"روشنی" کی ایک ہلکی سی کرن اُس پر اثر انداز ہوتی ہے۔گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک چھوٹا سا دیا روشن کر دیا جائے تو وہ سارے کا سارا اندھیرا تو ختم نہیں کرتا لیکن ایک مسافر کو اگلا قدم اٹھانے تک کا راستہ ضرور دکھلا دیتا ہے۔اس لئے روشنی کا خواہشمند ہونا ایک فطری سی بات ہے۔ساجد خان کے افسانوی مجموعے" مجھے روشنی چاہئیے" دیکھ کر دو سوالوں نے فوری طور پر ذہن میں جنم لیا۔سب سے پہلے تو اُستاد قمر جلالوی کی ایک خوبصورت غزل جس کے آخری دو اشعار آپ کی سماعتوں کی نذر ہیں:

تیرے میرے ملاپ پر دشمنوں کی سازشیں
وہ سانپ رینگتے ہوئے چنبیلیوں کی اوٹ میں
چلو کہ اب بجھے بجھے سے گھر کا مرثیہ کہیں
وہ چاند تو اُتر گیا حویلیوں کی اوٹ میں

آپ ان اشعار کے فلسفیانہ پہلوؤں میں نہ اُتر جائیں غرض وغایت صرف حویلیوں سے تھی کہ افسانہ نگار موصوف کا تعلق "حویلیاں" سے ہے۔اگر چہ جو اشعار میں نے پڑھے ان کے مصرعہ آخر میں چاند حویلیوں کی اوٹ میں ڈوب گیا لیکن افسانوی ادب کا یہ چاند ساجد خان تو "طلوع" ہوا ہے۔طلوع کے عمل کے بھی اپنے مرحلے ہیں۔جسے سب سے پہلے اندھیرے کو شکست دینا ہوتا ہے۔طلوع ہی روشنی کی طرف سفر کی ابتدا ہے۔میں نے آپ سے کہا تھا کہ ابتدائی طور پر دو سوالوں نے جنم لیا تھا۔میرے ذہن میں دوسری جوبات فوری طور پر آئی وہ یہ ہے کہ کتاب کے ٹائیٹل کو اگر مجازی معنوں میں لمحہ موجود کی کیفیات پر apply کیا جائے تو loadshading کے عذاب نے پوری قوم کو جکڑ رکھا ہے۔ان حالات میں "موصوف کی پکار" مجھے روشنی چاہیے بڑی موزوں اور بر ملا و بر محل ہے۔ان دو سوالوں کے جوابات میں اس کتاب میں ڈھونڈنے کی کوشش ہرگز نہیں

کروں گا کیونکہ ساجد خان نے اپنے جذبات ومحسوسات کوزیب ارطاس کرتے ہوئے نجانے ''روشنی'' کوسوچ اورگمان کے کس مرحلے میں رکھا ہوگا۔اس غرض آلودمعاشرے میں یہ توقع رکھنا کہ کوئی دوسرا آپ کوروشنی مہیا کرے گا کسی حدتک خام خیالی کے زمرے میں آتا ہے۔اگر ہر شخص دوسروں کے لئے روشنی مہیا کرنے کی مخلصانہ روش اپنا لےتو ظلمتیں ازخود مٹ سکتی ہیں......بقول فراز:

سلسلے توڑ گیا وہ سب ہی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے
شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

اگرفردمعاشرے میں اپنے حصے کی شمع جلانے اورجلاتے رہنے کی روش کوحقیقی معنوں میں اپنا لےتو کوئی وجہ نہیں کہ ''روشنیوں'' کی فراوانیاں ہوں اورکسی کوروشنی طلب کرنے اوراُجالا مانگنے کی نوبت نہ آئے۔اندھیرا چونکہ روشنی کی قید میں ہے اسی لئے عین ممکن ہے کہ اندھیرا ایک مسافر کے راہ بھٹکنے کا سبب بھی بن جائے۔پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ روشنی کی روش کے عادی افراد اگر اچانک اندھیرے میں چلے جائیں،اُجلی یادوں کے حصار سے نکل کرتلخ یادوں کی ظلمت کی لپیٹ میں آ جائیں تو بھی صورتِ حال افسوس ناک ہوجاتی ہے اورحاضرینِ محترم انہی کیفیات کے تناظر میں افسانہ جنم لیتا ہے:

جو رستہ تیرے گھر کو جائے ہم کو یاد رہتا ہے
مگر پھولوں بھری راہیں ہم اکثر بھول جاتے ہیں
ہمارے حافظے کی اِک زمانہ داد دیتا ہے
مگر تم یاد آؤ تو زمانہ بھول جاتے ہیں

اچھی،خوشگوار اوردلنواز یادیں روشنی کی علامتیں ہیں اوراس کے برعکس تمام تر کیفیات

اندھیر نگری کی باسی ہیں۔ ہمارے ہاں افسانوی ادب کو جس توانائی سے آگے بڑھنا چاہئیے تھا اس شدت اور قوت سے آگے نہ بڑھا یعنی مجھے جن افسانوں کو پڑھنے کا موقع ملا انہیں اگر غلام عباس کے ''اوورکوٹ'' سے ساجد خان کے ''چھوٹے'' تک پھیلا دیا جائے تو چند ایسے نام سامنے آتے ہیں جنہوں نے افسانے کے جدید تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ایک کامیاب افسانہ وہ ہوتا ہے جو متعلقہ تہذیبی وثقافتی روایات سے جڑا ہوا ہو۔ جس میں عہدِ رفتہ کے لطیف لمحات کا تذکرہ ہو اور لمحۂ موجود کی محرومی کا نوحہ بھی۔ جو قاری پر اپنی گہری گرفت کو یقینی بناتا ہوا نظر آئے۔ قاری خود کو اس حصار سے باہر لانے کی سعیٔ مسلسل کرتا نظر آئے لیکن آخر تک وہ ایسا نہ کر سکے۔ ساجد خان کی تحریروں میں کہیں کہیں وہ افسانوی کردار نظر آتے ہیں جو ہماری روزمرہ زندگی میں ہمارے قرب و جوار میں موجود نظر آتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر شخص اپنے دل کی کیفیات کو لفظوں کا پیرہن دے کر ایک افسانہ تخلیق کرلے۔ شکست وریخت سے دوچار ہونے والا فرد خود ایک چلتا پھرتا افسانہ بن جاتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی اس کو پڑھنے کا ہنر جانتا ہو:

گم سم ہوا آواز کا دریا تھا جو اک شخص
پتھر بھی نہیں اب ستارہ تھا جو اک شخص
شاید وہ کوئی حرفِ وفا ڈھونڈ رہا تھا
چہروں کو بڑے غور سے پڑھتا تھا جو اک شخص

ہمارے سامنے ایک ہنستا کھیلتا، ہشاش بشاش شخص کبھی کبھی اچانک کسی ویران حویلی کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور اندر سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے مگر:

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح — دیکھو تو اِک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

ساجد خان کے افسانوی مجموعے کی ہر کہانی اپنے اندر درد کا کرب اور ایک نیا پرتو لئے ہوئے ہے۔ میں تو بات کروں گا صفحہ نمبر ۸۰ پر درج افسانے کی جس کا عنوان ہے ''گھروندا'' ......وہی گھروندا جو کسی مفلس، کسی قلاش کی کل کائنات ہوتا ہے اور ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

بارش کی دُعا مانگنے والے تُو نے
شاید کسی مفلس کا گھر نہ دیکھا

اس مختصر تحریر میں ساجد خان نے ''فکر'' کے کئی دریچے وا کئے۔ صرف ایک extract سماعت فرمایئے:

''جہاں میں بیٹھا ہوں یہ دوسری دنیا ہے......اس دنیا میں اوپر بھی مٹی، نیچے بھی مٹی، اطراف میں بھی مٹی اور مٹی میں بھی مٹی پڑی ہے۔ وہی مٹی جس سے جاندار بنائے گئے، جس سے بناتات نکالے گئے، جس سے حیوانات تشکیل دیئے گئے، چرند، پرند، درند اسی سے پیدا کئے گئے، یہ سب کچھ ہوا اور ایک لفظ سے ہوا......شاید لفظ ادا کرنے اور ان کے ہو جانے میں کوئی ہو جانا ہی تھا''۔

مصنف موصوف نے اپنی اس کاوش میں ''مٹی'' کی جتنی حیثیتوں پر روشنی ڈالی ہے یہ انہی کا حصہ ہے۔ یہ مٹی ہی ہے جو آپ کی تشکیل کا حصہ ہے جس سے دُوری آپ کی تذلیل کا باعث بھی بن جاتی ہے:

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

میں ساجد خان کو اس عمدہ کاوش پر دِل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دُعا گو ہوں کہ ان کا یہ فنی سفر اسی توانائی سے جاری رہے۔ کیونکہ انہوں نے عہدِ حاضر میں کم و بیش ہر شخص کے کارو گرد پھیلے دکھوں کو جس خوبصورتی سے زیبِ ارطاس کیا ہے فنی اعتبار سے یہ ایک انتہائی لائقِ تحسین قدم ہے۔ میں حرف اکادمی کے اربابِ بست وکشاد کی بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ قارئین ادب کے لئے ایک خوبصورت کتاب کی تعارفی تقریب کا انعقاد کر کے انہوں نے ادب نواز ہم وطنوں کو بھی تحریریں پڑھنے کا موقع فراہم کیا۔

(حرف اکادمی پاکستان راولپنڈی کے زیرِ اہتمام تقریبِ رونمائی......۲۵ جون ۲۰۱۱ء)

مجھے روشنی چاہیے ......از ساجد خان

الیاس بابر اعوان ......سیکرٹری حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی

لفظوں کے اس میلے میں اپنی اپنی سوچ کے پھولا ٹھائے نجانے کتنے مسافر خریداروں کے منتظر ہیں ۔نجانے کتنی سعید ساعتیں اس انتظار کی نذر ہو جاتی ہیں اور پھول کاغذ کی طرح بے جان ہو کر قدموں میں گر جاتے ہیں ۔اس گرد گرد ماحول میں جہاں آئینے دُور تک غبار آلود پیشانیوں اور بے نُور چہروں کا ایک بے ہنگم ہجوم دکھاتے ہیں ۔وہاں مضافات سے اٹھنے والی ایک آواز" مجھے روشنی چاہیے'' آئینے سے گرد ہٹا دیتی ہے ۔منظر نکھر کر سامنے آجاتا ہے ۔جی ہاں! میں بات کر رہا ہوں ساجد خان کی کہانیوں کی جو" مجھے روشنی چاہیے'' کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہیں ۔

شعرگروں کی بستی میں نثر کا علم اٹھائے ساجد خان اپنے پہلے تعارف میں بیانیہ لگا ۔کہانی نے بیانیہ absurd symbolic اور پھر سے بیانیہ کا روپ دھار لیا ۔گویا یہ کہانیاں آج کی کہانیاں ہیں ۔اندھیرا اپنی گھمبیرتا بڑھائے چلا جا رہا ہے ۔نظر کے زاویے ترچھے ہو چکے ہیں ۔لفظ کی توقیر کم پڑ گئی ہے ۔ادب crisis کا شکار ہے ۔مگر کہانی ہے کہ بولتی ہے ۔جب تک انسان زندہ ہے کہانی زندہ ہے ۔بیانیہ کہانی وقوعے کر گرد گھومتی ہے ۔سامنے کی بات کو افسانوی رنگ دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے مٹی کی شمع بنا کر اس سے روشنی کشید کرنا ۔

" مجھے روشنی چاہیے'' کا سفر جواز سے شروع ہوتا ہے ۔یہیں سے کہانی کار کے تیور کھل کر سامنے آجاتے ہیں بہت عمدہ لگی ۔تخلیق کار نے اپنی تخلیقی خوش گمانی کا بھرم دیگر کہانیوں میں بھی رکھا ۔" آخری اُڑان'' میں ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جو زندگی کے کئی برس سمندر پار گزارتا ہے ۔خون پسینے کو ڈالروں اور درہموں میں بدلنے کے بعد جب واپس لوٹتا ہے تو جدید طرز کے گھر میں اس کے اعزاء اور بہن بھائی اس کے منتظر ہوتے ہیں ۔جو دراصل تحائف کے منتظر ہوتے ہیں ۔کہانی کے آخر میں وہ ماں سے پوچھتا ہے کہ آپ کو کیا چاہیے تو وہ کہتی ہے کہ" بیٹا کچھ نہیں چاہیے بس! اب

کی بار پندرہ سالوں کے بجائے سال دو سال بعد آجاتا ......اس کہانی میں ایک بیٹے کا داخلی کرب دکھایا گیا ہے اور بڑی جسارت سے اس کو portray کیا گیا ہے۔

آکاش کی کہانی ایک ایسے بچے کی کہانی ہے جو غربت کے ہاتھوں میں کھیل بنا ہوا ہے۔ایک بچہ جو جوتے نہ ہونے کے سبب چار دن سکول سے چھٹی کرتا ہے اور بالآخر چار دن بعد سکول جاتا ہے تو زنانہ چپل پہن کر جاتا ہے۔یہ حقیقت پسندی جو قدرے تلخ ہے بہر حال ہمارے معاشرے کا ایک اہم المیہ ہے۔ایک کہانی ''سومی''معروضی مگر تلخ حقائق کو بڑی خوبصورتی سے پینٹ کرتی دکھائی دیتی ہے۔وہشت گردی کے ہاتھوں اپنی ڈاکٹر بیٹی کو کھو دینے والے ماں باپ کا الم ساجد خان نے نہایت عمدگی سے محسوس کیا ہے۔

کہانی ''اثاثہ'' کے ابتدائی حصہ میں کتبہ یا دولا دیا لیکن بڑی خوبصورتی سے کہانی کار نے ایک ایسے میاں بیوی کو کہانی بنایا ہے جو اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو قربان کر کے اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ بناتے ہیں اور اس میں طمانیت محسوس کرتے ہیں۔منشایاد صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ ایک اچھے کہانی کار کو چاہیے کہ کہانی کا اختتام فلمی انداز میں نہیں ہونا چاہیے۔فلمی انداز سے مراد ایسا اختتام ہے جو اخباری نوعیت کا ہو اور جسے ذہن تسلیم کرتے ہوئے ہچکچائے۔کچھ کہانیوں میں مجھے بھی یہی مسئلہ نظر آیا جیسا کہ کہانی ''انقلاب'' میں......ساجد خان نے بہت مختصر کہانیاں لکھی ہیں۔کرداروں کی جزئیات نگاری کا عنصر کھل کر سامنے نہیں آیا۔

پانچ کا پینتالیس بھی ایک ایسی معاشرتی حقیقت ہے جسے کہانی کار نے بڑی آسانی سے قاری کے سامنے رکھا۔معاشرے کا وہ پسا ہوا طبقہ جو آسمان کی تپتی چھتری تلے پرندوں کی طرح اپنا رزق تلاشتا نظر آتا ہے......جو ہماری نظر کے آئینے میں ہو کر بھی نظر نہیں آتا ......اس کے بارے میں کہانی لکھنا تخلیق کار کی دردمندی کو ظاہر کرتا ہے۔

بنیادی طور پر میں نے ساجد خان صاحب کو معاشرتی ناہمواریوں اور عصری جبر کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے پایا۔گو یہ ابتدائے سفر ہے۔کہانی لکھنا ویرانے میں چوپال سجانا ہے۔مجھے امید ہے

کہ صحرا نوردی انہیں تھکنے نہیں دے گی ۔ یہ مستقبل میں کہانی اور افسانے کی مختلف تیکنیک کو بھی استعمال کریں گے۔ موسپاں، کافکا، منٹو، غلام عباس، پریم چند، انتظار حسین، منشا یاد اور حمید شاہد کا مطالعہ نہ صرف وسیع النظری پیدا کرے گا بلکہ ان کے ہاں امکانات کے نئے در وا کرے گا۔ جو چیز سب سے اچھی ہے وہ ان کے احساس کی رو ہے۔ جسے تپیا سے نہ صرف پختہ کرنا ہے بلکہ افسانوں کی حقیقی دنیا میں گیان کا اگلا گوتم بھی بننا ہے...... نیک تمنائیں۔

(حرف اکادمی پاکستان راولپنڈی کے زیر اہتمام تقریب رونمائی ......۲۵ جون ۲۰۱۱ء)

مجھے روشنی چاہیے

شمیم حیدر رسید

کچھ دن قبل ممتاز شاعرہ فرزانہ جاناں نے مجھ سے کہا کہ نوجوان افسانہ نگار ساجد خان کے پہلے افسانوی مجموعے "مجھے روشنی چاہیے" کی تقریب رونمائی ہے۔ آپ نے مہمانِ خصوصی کے طور پہ آنا ہے اور بڑے فخر سے یہ بھی بتایا کہ یہ ہماری حرف اکادمی پاکستان کرا رہی ہے۔ میں سوچنے لگا کہ اس دور میں کوئی مہمان کو ہی قبول کر لے تو بڑی بات ہے نا کہ اس کے ساتھ "خصوصی" بھی لگا دیا جائے تو میزبان کے ساتھ دوسروں کی برداشت کا امتحان بھی شامل ہو جاتا ہے۔

"مجھے روشنی چاہیے" ساجد خان کی ۲۲ کہانیوں اور افسانوں پر مشتمل پہلی کتاب ہے۔ میں ساجد خان سے پہلے بالمشافہ نہیں ملا لیکن کسی بھی شاعر، ادیب یا لکھاری سے ملاقات ہو تو سونے پہ سہاگہ...... ورنہ ملاقات ضروری نہیں کیونکہ تخلیق کار کا فن بذاتِ خود اس کی سب سے بڑی پہچان ہوتا ہے۔ میں نے ساجد خان سے اس کی کتاب کے ذریعے بڑی طویل ملاقات کی اور اس کی کتاب میں اپنے پرانے حلقہ اربابِ ذوق کے دوست اور ساتھی احمد جاوید کی یہ بات حقیقی لگی کہ "ساجد خان کی کہانیوں کے واقعات ان چنگاریوں کی طرح ہیں جو ایک بڑے الاؤ سے اٹھتی ہیں، بہت بلند ہوتی ہیں، سب کو نظر آتی ہیں مگر پھر راکھ بن کر سروں پہ آ گرتی ہیں"...... ہم آج جس دور سے گزر رہے ہیں اس دور میں بہت زیادہ اور معیاری ادب تخلیق ہونا چاہیے اور بہت اچھا ہونا چاہیے جو عوام کے دلوں پر اثر انداز ہو کیونکہ اچھا ادب ہمیشہ کرائسز میں ہی تخلیق ہوتا ہے۔ ہم آج جس سماج میں رہتے ہیں اس میں سانحات اور المیے اس طرح پھوٹ کر تناور درخت بنتے جا رہے ہیں کہ اگر ان کی اب بیخ کنی نہ کی گئی تو پھر بے بسی اور لاچارگی کے ساتھ ہم اپنے ہی کاندھوں پر اپنی لاشیں اٹھائے گھٹ گھٹ کر زندگی کے دن پورے کریں گے۔ ہمارے ملک میں جو حالات ہیں نہ بجلی نہ پانی، نہ کپڑا نہ دوائی نہ دارو...... ایک لے دے کر غریب کے پاس دم درود کا سہارا تھا ...... سو وہ بھی بدعتوں کی فیکٹریوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔

بات ساجد خان کی کتاب کی ہو رہی تھی ۔ میں پٹڑی سے اتر گیا اور یہ بھی ہر دور کے پڑھے لکھے انسان کی کمزوری ہے ۔اسی لئے میاں صاحب نے کہا تھا:

عقل ہووے تے سوچاں بڑیاں   نہ ہووے تے موجاں بڑیاں

ساجد خان کے مجموعے کو پڑھتے ہوئے ان کے جواں عزم ہونے کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے۔وہ انتہائی سادہ زبان میں لطیف و نازک خیالات اور معاشرتی ناہمواریوں کو الفاظ کا پیراہن پہناتے ہیں ۔مجھے یاد ہے، کیونکہ میرا تعلق بھی علمی و ادبی گھرانے سے ہے، میرا گھر محافل، مجالس و مشاعرے کا ایک عرصے تک مرکز رہا اور آج بھی ہے ۔اس کے علاوہ والدِ محترم ابو محمد منتظرؔ اور برادرِ عزیز شہید عون محمد رضوی کی انگلیاں پکڑ کر ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اور جوتیاں سیدھی کرتے کرتے میں نے بچپن ہی میں علمی و ادبی محفلوں اور مشاعروں کی خوب سیر گشتی کی ۔ پہلے تو اتر سے علمی و ادبی مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے پھر رفتہ رفتہ لوگ دنیاوی آلودگی میں پھنستے گئے اور ان تقاریب میں کمی آنا شروع ہو گئی حالانکہ یہ فطری امر ہے کہ ہر تخلیق کار جذبے کا اظہار چاہتا ہے اور ادبی سلیقہ مندی ادبی محفلوں سے ملتی ہے ۔اگر علم صرف کتابوں سے حاصل ہوتا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے علم کہاں سے حاصل کیا جنہوں نے کتابیں تخلیق کیں؟

جب انسان جبر اور برداشت کی قوتوں سے تجاوز کر جائے اور معاشرے میں بے یقینی کی کیفیت ہو تو اچھا ادب تخلیق ہوتا ہے ۔کیونکہ وہ ظلم اور جبر کی چکی میں پس کر اور سچ کی چھلنی سے نکھر کر اور کرب کے آنسوؤں سے ڈھل کر لکھا جاتا ہے ۔اور جب وہ منظرِ عام پر آتا ہے تو عوام الناس کے دلوں پر اثر کر اثر کرتا ہے ۔پھر انقلاب روس آتا ہے ۔انقلاب فرانس رونما ہوتا ہے ۔چین کی نشئی قوم دُنیا کی سپر پاور بن جاتی ہے اور دنیا میں سب سے طاقتور شہنشاہ ایران کے خلاف عوامی قوت کا وہ زبردست مظاہرہ دیکھتی ہے کہ اس شہنشاہ کو دنیا میں دو گز زمین بھی میسر نہیں آتی اور آج ۳۲ سال کے بعد بھی دنیا کی سپر پاور امریکہ علم و عمل میں ڈھلی اور دانشوروں اور عالموں کی جگائی ہوئی اور سکھائی ہوئی قوم کا بال بیکا نہیں کر سکی ۔اسی طرح قیامِ پاکستان اور دیگر آزادی حاصل کرنے والے ممالک

میں بھی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے کردار سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے قوموں کو بیدار کرنے کے لئے حق اور سچ کی آواز بلند کی تو قلم کی نوک سے، تلوار کی دھار اور بندوقوں اور توپوں سے نکلنے والی آگ کو بھی شکست سے دوچار کر دیا اور جب قومیں جاگیں تو بڑے بڑے آمروں نے بھی عوامی طاقت کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔

آج اس پروقار محفل میں، میں ساجد خان کے ساتھ خود اور پورے ہال کی تائید سے پاکستان کی خوشحالی اور آنے والے مستقبل کے معماروں کے لئے نعرۂ انقلاب بلند کرتا ہوں کہ "مجھے روشنی چاہیئے" اپنے وطن کے لئے، آنے والے مستقبل کے معماروں کے لئے۔ لاغر، سسکتی اور سلگتی انسانیت کے لئے، معاشرتی اور معاشی ناہمواریوں کے ازالے کے لئے...... "مجھے روشنی چاہیئے"۔ اگر یہ روشنی روشن نہ ہوئی تو تاریخ کا مورخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ کیونکہ مادر وطن کو جتنی آج ادیبوں اور دانشوروں کی رہنمائی کی ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی...... خدا ہمارا حامی و ناصر رہے...... بہت بہت شکریہ۔

(حرف اکادمی پاکستان راولپنڈی کے زیر اہتمام تقریب رونمائی...... ۲۵ جون ۲۰۱۱ء)

ساجد خان کا اسلوب

عادل سعید قریشی

ساجد خان اردو افسانے میں ایک تازہ لب و لہجے اور طرز کا نام ہے۔ساجد خان ایک صاحب اسلوب افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانے کئی لحاظ سے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ان کو ممتاز کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کا موضوعاتی تنوع،معروضی انداز بیان،ان کا بیانیہ سلیقہ،زبان و بیان کے بالغ قرینے،افسانے کی نفسیاتی عوامل کی ماہرانہ برت،خوش سلیقہ کردار نگاری،پختہ مکالمہ نگاری،لفظوں سے مصوری اور انسانی فطرت نگاری بالخصوص قابل لحاظ ہیں۔ان کے افسانوں میں انسان دوستی،معاشرتی کجیاں،انسانی کمزوریاں،دیہات نگاری،ہوس و ایثار،فریب و سادہ لوحی،حرص و استغنا،سازش و خلوص،غرض انسانی زندگی کے سبھی سیدھے اور ٹیڑھے زاویوں کے نظارے قاری کو ایک خوشگوار حیرت اور مانوس مسرت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کو پڑھ کر میرے دل میں جو سوال پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ساجد کے افسانے کیوں اس قدر خوش رنگ اور متاثر کن ہوتے ہیں؟ لہذا ان کے اسلوب کو دیکھنا چاہیے کہ کیا یہ بھی اسی کی دین تو نہیں۔

اسلوب،ایک خاصی وقیع و وسیع اصطلاح ہے جس کی حدود بندی کے لیے خود ایک ضخیم مقالے کی ضرورت ہے۔بہر طور اسلوب سے مراد کسی بھی شاعر یا ادیب کا طرز نگارش ہے جو اس کو اسی صنف میں دیگر لکھنے والوں سے منفرد کرتا ہے۔بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

"اسلوب۔۔۔کی سادہ اور مختصر ترین تعریف کسی شاعر یا نثر نگار کا مخصوص انداز نگارش سے کی جا سکتی ہے۔اس لیے اسلوب اگر ایک طرف اچھے شاعر یا اچھے انشا پرداز کی شناخت کا باعث بنتا ہے تو دوسری جانب بعض اوقات قلم کار کی شخصیت کا مظہر بھی ثابت ہو سکتا ہے"(۱)

اور اگر یوں کہا جائے کہ اسلوب کسی بھی فن کار کا لکھنے اور بیان کرنے کے وسائل کا استعمال اور اس کے خیال اور طرز بیان کا انداز ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔اسلوب،درحقیقت فنی تجربے کی دین ہوتا ہے کسی بھی فن سے کامل آگاہی،اس صنف کا مطالعہ،ندرت فکر،تخیل کی ارفعیت اور اعلیٰ لفظیات ہی

کسی بھی فن کار کے اسلوب کو جنم دیتی ہیں بالفاظ دیگر اسلوب صنف اور اساتذہ صنف کے قائم کردہ معیائیر پر پورا اترنے کا نام بھی ہے ۔اسلوب کسی ایک افسانہ نگار یا کسی بھی لکھاری کا وہ انداز بھی کہلاتا ہے جو اس کے شخصی کوائف، رجحانات، مسلک وعقیدہ کی بنا پر بھی انفرادیت حاصل ہوتی ہے۔اس کا یہ اختلاف یا نرالا پن اس کے اپنے ذاتی مطالعہ، علم، فہم، معروضی انداز تفکر پر بھی انحصار کرتا ہے کیونکہ اسلوب فن بھی ہے اور منتہائے فن بھی ہتو بے جا نہ ہوگا۔اسلوب کی دلآویزی ادب کی معراج ہے اس لیے فن کار اپنے اسلوب کے لیے ہر گھڑی اور ہر زاویہ سے مصروف عمل رہتا ہے۔

ساجد خان کے اسلوب میں جو چیز نمایاں دکھائی دیتی ہے وہ اس کی زبان ہے۔اس کے افسانوں کی زبان دو خاص وصف رکھتی ہے اوّل زبان سلیس ہے اور دوم سادگی اور اثر آفرینی رکھتی ہے۔افسانہ غیر علمی زبان کا متقاضی ہوتا ہے۔ساجد خان اس حقیقت سے خوب آگاہ ہے اور اس نے اپنے افسانوں میں روزمرہ کے عین مطابق لکھی ہے۔اس کا محاورہ گو کہ ہندکو کے اثر سے مامون نہیں لیکن اردو قواعد کا احتیاط سے استعمال کیا ہے۔زبان میں الفاظ وتراکیب میں کوئی اجتہادانہ کام نہیں کیا گیا کیوں کہ ہم مقامی بولیوں والے ایسا کوئی کام کر بھی نہیں سکتے کیوں کہ ہم ہندکو میں سوچتے اور بولتے ہیں اور ہندکو ترجماتے وقت روزمرہ یا محاورہ کی بھول چوک فطری امر ہے۔مقامیت کا در آنا ایک خوش آئند امر ہے مگر نیت کر کے ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ ہر دو صورتوں میں اردو زبان کا مزاج ہی وہ کسوٹی ہے جو اس مقامی لہجے، تلفظ، لفظ اور اصطلاح کو قبول یا رد کرنے کا حق رکھتا ہے۔

ساجد خان کے ہاں زبان کی سلاست صفتِ خاص کے طور سامنے آتی ہے۔زبان کی یہ سلاست ان کے ہاں تازگی اور شگفتگی کو جنم دیتی ہے۔یہی خوبی روانی اور ترسیل معنی کو یقینی بناتی ہے۔فکشن میں ایسی خوبی ادب پارے کی چاشنی اور دلکشی کا سبب بھی بنتی ہے۔افسانے میں خاص طور پر زبان کی یہ خوبی اس کے تاثر کو مزید چوکھا کرتی ہے اور افسانوی ادب کی اساسی کلید بھی مانی جاتی ہے

کیونکہ افسانہ اپنے اختصار کے سبب زبان کی شگفتگی اور شائستگی کا زیادہ تقاضا کرتا ہے۔ یہ دونوں خوبیاں خاصی محنت اور جاں فشانی چاہتی ہیں۔زبان کی ہر خوبی کرافٹنگ کی دین ہے جس میں لکھاری اپنے بیان، اور وسائل بیان بالخصوص لفظیات کو تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے اور ہر ہر لفظ کو معنوی اعتبار سے پرکھتا رہتا ہے۔ اپنے خیال کے یقینی ابلاغ کے لیے مترادفات اور مراد فات سے سہارا لیتا ہے۔ساجد خان کے ہاں اس کی منجھی ہوئی کرافٹنگ اس کے ہر افسانے کی بنت اور بڑھوتری کو تاثیر اور روانی دیتی ہے۔ساجد کے لفظ، جملے، تراکیب سازی اور خوبصورت تلازمے کے ساتھ تکرار حرفی ولفظی قاری کو اپنے سحر میں لے لیتی ہے۔ساجد اپنے افسانوں میں فصیح سے فصیح تر اور بلیغ سے بلیغ تر جملے لکھتا جاتا ہے۔وہ نپے تلے انداز میں اپنا مدعا بیان کرتا جاتا ہے اور اپنی نثر کو حشو و زائد سے مامون رکھتا ہے۔لفظ کو لفظ کے ساتھ یوں بٹھاتا ہے جیسے کوئی ماہر معمار ہو۔ایک ایک جملہ اپنے معمار کی ذہانت، بلاغت،فہیم اور ذی شعور ہونے کی گواہی دیتا ہے،مثال ملاحظہ کریں:

"میں پاگل نہیں ـــــ میں حقیقت پسند ہوں۔میں نے اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کیا ہے حضور!والد نے یہی کہا تھا کہ

بیٹا علم میں عظمت ہے۔کتاب اصل دوست ہے۔میں نے کتابیں تھامیں ـــ علم حاصل کیا اور بے موت مارا دیا گیا ـــ آج

سب مجھ پر نوحہ کناں ہیں کیا اپنے اور کیا بیگانے"(۲)

"اچانک قوس قزح سے کہیں زیادہ دلکش رنگ ایک دوسرے میں ملتے ملاتے عجیب منظر پیش کرنے لگتے ہیں ـــ

دھیرے دھیرے مختلف رنگ سفیدی میں بدلتے جا رہے تھے۔تھوڑی ہی دیر میں ہر جانب سفیدی پھیل چکی تھی۔میں جس

جانب بھی دیکھتا آنکھیں چندھیا دینے والی سفید روشنی تھی۔کبھی تو ایسا لگتا کہ ہر جانب آئینے ہیں جو

روشنی کو منعکس کر رہے ہیں"   (۳)

ان اقتباس کی کرافٹ بتلا رہی ہے کہ کسی مشاق افسانہ نگار نے محنت شاقہ سے لفظوں کو چنا اور ایک سلجھا ور منجھے ہوئے انداز میں اپنا مدعا بیان کیا۔لفظوں کا دروبست اوران کا معنوی حسن قاری سے دادخواہ ہے۔

ساجد خان کے زبان کی ایک اور خوبی جوملتی ہے وہ ان کا لفظیات کا متوازن اور برمحل چناؤ ہے۔غزل اورافسانہ اپنی لفظیات کی وجہ سے ہی تاثر پیدا کرتے ہیں کیوں کہ ان دونوں کا حسن ان کے ایجاز اوراختصار میں مضمر ہے۔افسانے میں چاشنی اور شیرینی لفظ کی ایماندارانہ ڈھونڈ اور بلیغ استعمال کی رہین منت ہے،لفظ کی مناسب ترین چناؤ اور فصیح ترین برت تحریر کو اثر آفرینی کی دولت سے مالامال کرتی ہے۔اثر آفرینی کے متعلق صاحب زادہ حمیداللہ لکھتے ہیں:

"علی اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پڑھنے والے کو ایک خاص فضا میں فطرت،اخلاق اورروحانیت کی حقیقتیں جس
قدر زیادہ ہوں گی اتنا اسلوب کا اسلوب کا مرتبہ بلند ہوگا۔یہی اثر آفرینی ہے۔"(۴)

ساجد خان کے افسانے ان دوخوبیوں سے مزین ہیں۔اثر آفرینی کا عالم یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک کہانی شروع کر دیجیے پھر کہانی ختم کیے بنا آپ رہ نہ پائیں گے مثلاً ساغ،وی،خلش،نئی کہانی وغیرہ۔

دیگراصناف کی طرح افسانے کا موضوع بھی زندگی ہے۔زندگی کی رنگا رنگی لکھاری کو کئی رنگ اور روپ سروپ دکھاتی ہے۔لکھاری اپنے تجربے کی موضوعیت اورخیال تجریدیت کو اپنی پیش کش میں ڈھالتا ہے تو کہانی،کردار اور وحدت تاثر میں جب گندھ کر صورت اختیار کرتے ہیں تو اس صورت گری میں ہمیں صاحب اسلوب کی سادگی اور جوش بیان،اصلیت اور حقیقت نگاری،شائستگی اور تازگی،جامعیت اوراختصار،متانت اوربذلہ سنجی غرض کئی اورعوامل مل کر اس کے اسلوب کی بھی صورت اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ساجد کے افسانوں میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی نمایاں

طور پر موجود ہے۔ جملہ بازی، پھکڑپن اور بے جا طوالت ہرگز نہیں دکھائی دیتی۔ ساجد خان کے لفظ و معنی کی متین برت، دلکش ترکیب سازی اور تکرار حرفی و لفظی کی ایک دو مثالیں "دائرے کے اسیر" سے دیکھیں دیکھیے:

۱۔ماں کی آغوش میں سر نہوڑائے ماتھے پر ماں کے ہونٹوں کا لمس رہ رہ کر یاد آنے لگا۔

ص ۸۴

۲۔چاندنی رات مجھے بہت اچھی لگتی ہے، ہر طرف سکون ہی سکون ـ ـ ـ ـ

ص ۴۸

۳۔ہر ایک کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار ہے ـ ـ ـ بس مسئلے کی نوعیت الگ الگ ہے۔

ص ۹۵

۴۔کئی تو تین تین، چار چار چہروں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

ص ۱۰۴

ساجد کے افسانوں میں ان کا خطیبانہ انداز بھی ان کے افسانوں کو عام ڈگر سے الگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔خطابت کی وجہ سے ان کے افسانے بلند آہنگ ہوئے ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں بڑی سہولت سے خطیب کا بھیس بدل کر آجاتے ہیں اور وعظ و نصیحت کے پھر کہانی کو تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔یوں کہانی کو ہائی جیک کرنا اور اپنے خطاب سے قاری کو مستفیض کرنے کے متعلق دو مکاتب فکر موجود ہیں ایک وہ جو کہانی میں یوں آجانے کو مذموم تصور کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو کہتے ہیں کہ اعلیٰ ادب اعلیٰ معاشرے اور مستحسن اقدار کو فروغ دیتا ہے جیسے میتھیو آرنلڈ اسی ادب کو حقیقی ادب گردانتا ہے جو ادبی حسن کے ساتھ ساتھ معاشرتی اقدار کی سدھار کرے۔لیو ٹالسٹائی بھی حقیقی فن اسی ادب کو مانتا جو انسانی اقدار و روایات کا امین ہو۔بہر طور ساجد خان "دائرے کے اسیر" میں خطابت خوب جوہر دکھاتے ہیں۔مثلاً صفحات نمبر ۴۱، ۴۲، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۷۲، ۱۰۲، ۱۱۰، ۱۱۹ وغیرہ۔

شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے:

''افسانہ نگار اور قاری کے درمیان ایک زبردست معاہدہ موجود ہوتا ہے کہ افسانہ نگار
جو بھی کہے گا قاری اس پر اعتبار کرے گا
تو کیا افسانہ نگار کی یہ ذمہ داری نہیں ٹھہرتی کہ وہ کچھ نہ کہے صرف دکھلا دے۔ بیان نہ کرے صرف
پیش کر دے۔''(۵)

دوسرے لفظوں میں فاروقی صاحب کہہ رہے ہیں کہ کہانی کار اپنی کہانی، کرداروں، مکالموں اور بنت سے الگ تھلگ رہے۔ایسا بالکل بھی ممکن نہیں مگر ہاں اثر انداز (influence) نہ کرے یہ ممکن بھی ہے اور مستحسن بھی ہے۔ساجد خان ''دائرے کے اسیر'' میں تو خاص طور پر ایک مصلح، مبلغ، معاشرتی اصلاح کار، استاد اور لیکچرار بن جاتے ہیں۔ساجد خان کے افسانے اپنے خالق کی ندرت فکر اور بیان کے بانکپن کے امین ہیں۔وہ عہد حاضر کے مسائل اور پریشانیوں کے عکاس ہیں۔افسانے صرف افسانہ نگار کے اظہار ذات کا ذریعہ نہیں ہوتے بلکہ اپنے خالق نظریہ حیات اور تصور فن کے وسیلے بھی ہوتے ہیں۔اسلوب کی صلابت اور موضوع جاذبیت کی مل کر ساجد کے افسانوں اپنے قاری کے لیے خاصہ کی شے بنا دیتی ہے۔اس مختصر مضمون میں ساجد خان کے اسلوب کا جتنا تجزیہ کیا گیا اس کا ماحصل یہ ہے کہ ساجد خان کا اسلوب لسانی وسائل کے منجھے ہوئے استعمال کے ساتھ ساتھ ادب کی جمالیاتی قدروں اور معاشرتی و ثقافتی اقدار کا حامل ہے۔ساجد کے افسانے اسی کے معاشرے اور اسی کے شہر و گاؤں کے کرداروں کی کہانیاں ہیں جو اسلوب میں ڈھل کر نہایت دلچسپ اور دلآویز افسانوں میں ڈھل چکے ہیں۔

دائرے کا اسیر ایک جائزہ

اجمل نذیر

فلسفیانہ اندازِ گفتگو، الفاظ کا برجستہ استعمال، فہم وفراست میں ڈوب کر نہاں سے عیاں کی سمت عازمِ سفر ہونا، افسانے کے اندر ماحول کی بھرپور وضاحت اور اس ماحول کے عین مطابق اندازِ گفتگو کا برتاؤ، افسانے کے کرداروں میں حقیقی جان ڈال کر ایسے مکالموں کی ادائیگی جس سے نہ صرف ماحول کی حقیقی عکاسی ممکن ہو بلکہ کرداروں کی بالغ نظری کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہو، یہ تمام تاثرات ساجد خان کی ابتدائی تحریر،" بے بسی، بے چارگی، درماندگی" کو پڑھ کر بے ساختگی سے اخذ کیے گئے ہیں۔

اس تحریر کا ایک کردار جب وسیع المطالعہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے گویا ہوتا ہے،" نہیں نہیں، یہ روح نہیں کئی اجسام ہیں، تم نے اصل کو پایا ہے تو پہلے نکتے کو ڈھونڈو۔ نکتہ وسیع دائرے میں ایک نقطے کے برابر ہے۔ اسی نکتے میں طاقت کے سارے سرچشمے ہیں۔ وہاں ارتعاش ہے، حرکت ہے، آندھیوں کی طرح تیز ہوائیں ہیں، ان ہواؤں میں آوازوں کی بازگشت ہے، آوازوں کو سنو! تب جان جاؤ گے کہ اصل کیا ہے"۔

اور اسی افسانے کے آخر میں مدلل گفتگو کرتے ہوئے یہی کردار کہتا ہے،" جب اصل ملے گا تب سکون اور ٹھہراؤ پاؤ گے، تمہاری دسترس میں اتنا ہی ہے، جتنا تمہیں ودیعت کیا گیا ہے، اس کے آگے الجھاؤ ہے، بے بسی ہے، بے چارگی ہے، درماندگی ہے، اصل تک رسائی سے سب قاصر ہیں، قاصر ہیں، قاصر ہیں"۔

دائرے کا اسیر ایک ایسا افسانوی مجموعہ ہے کہ جس کا ہر افسانہ قدم جکڑ لیتا ہے، الفاظ کی بُنت کانوں میں رس گھولتی ہے اور افسانوی ماحول دل کو متلاطم کیے رکھتا ہے۔ ایک کسک آگے جست بھرنے پر مجبور کرتی ہے، تو ایسے بے ساختہ اور بے شمار جملے جیسا کہ" سنو! میں

حقیقت پسند انسان ہوں، اور اگلے ہی لمحے وہ سوچنے لگا کہ حقیقت تو ننگی ہوتی ہے" ایسے جملے راستے میں دیوار بن جاتے ہیں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتے ہیں۔ ایسے میں قطرہ قطرہ گھلتا امرت ذہنی آسودگی کا باعث بنتا ہے اور تخیل کے دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں کہانیاں اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ گر ہو کر ساجد خان کے زورِ قلم کا تعین کرنے اور اعتراف کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔

ساجد خان کے افسانوی مجموعے کی خوبی مضامین کی رنگینی ہے۔ ایک سے ایک تحریر اپنے پلاٹ اور رکھ رکھاؤ کے حوالے سے دوسری تحریر سے یکسر مختلف ہے۔ موضوعات کا تنوع دائرے کا اسیر کو ایک بہترین افسانوی مجموعہ اور ساجد خان کو باشعور، قادر الکلام اور مستند لکھاری کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ان کی تحریروں میں جامعیت بھی ہے اور ٹھہراؤ بھی۔ کہیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ لکھاری نے اجلت کا مظاہرہ کیا ہو اور کڑی سے کڑی جوڑ کر تکمیلی مراحل طے کرنے کی کوشش کی ہو۔ اگر بحیثیت مجموعی ساجد خان کے افسانوں کو پرکھا جائے تو زیادہ تر مکالماتی انداز کو اپنایا گیا ہے۔ اس مکالمے میں خود کلامی کا عنصر زیادہ ہے۔ اس خود کلامی میں فلسفیانہ انداز گفتگو کو برت کر خود شناسی، خدا شناسی اور جہاں شناسی کے مراحل کو طے کیا گیا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ساجد خان کے اندر ایک کھوج کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ کھوج باطنی بھی ہے اور خارجی بھی۔ اسی کھوج کی نشاندہی ان کے افسانہ "سراغ" کا یہ آخری جملہ اس انداز سے کرتا ہے کہ جیسے وہ ساجد خان کے فکر و فن کا اعتراف کر رہا ہو اور تسلیم کر رہا ہو کہ ہاں یہی وہ مرکز و محور ہے جس سے الفاظ کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ جملہ کچھ یوں ہے کہ، "میرے باطن کی آنکھ کیا کھلی کہ ہر سو اجالا ہی اجالا ہو گیا"۔

خدا کرے کہ یہ باطن کی آنکھ کھلی رہے اور "مجھے روشنی چاہئے"، "دائرے کا اسیر" اور مزید کئی افسانوی مجموعے تخلیق ہوتے رہیں اور ہم ان سے استفادہ کرتے رہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آمین

ساجد خان کے افسانے اور کہانیاں

(معتبر ادباء کے تاثرات)

ڈاکٹر رشید امجد

ساجد خان کے ہاں تکنیکی تنوع موجود ہے جس کی بدولت وہ خارجی مظاہرِ فطرت کے ساتھ لاشعوری اور تحت الشعوری مظاہر کو بھی سہولت کے ساتھ کاغذ پر اتار لیتا ہے۔اس کے افسانوں میں باطن کا سفر ایک نئے صوفیانہ آہنگ کی پہچان کراتا ہے۔اس کا کمال یہ ہے کہ وہ تکنیکی قدرت کے ساتھ مشکل ترین مرحلوں سے با سہولت گزر جاتا ہے۔ساجد خان کی لفظوں پر گرفت بھی خاصی مضبوط ہے اور وہ کہیں بھی افسانوی ادب میں نووارد ہونے کا تاثر نہیں چھوڑتا۔

اس کے بعض افسانوں کی قرأت کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ ایک ایسا تخلیقی فنکار ہے جس نے علوم اور علم کے ضابطوں کی حدود سے بہت آگے نکل کر اُن رمز بھرے حقائق کو گرفت میں لیا کہ جن پر دسترس حاصل کرنا ہر لکھنے والے کا نصیب نہیں ہوتا۔اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اُس نے افراد کے جن ابنارمل رویّوں کو پیش کیا ہے ان میں سے چند ایک ایسے نازک رویّے ہیں کہ جو ابھی تک نفسیات کی اصطلاحوں کی گرفت میں نہیں آسکے۔......اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

محمد منشاء یاد

ادب انسان اور انسانی مقدر کو سمجھنے کا ذریعہ ہے اور انسان کو سمجھنے کا مطلب اُس کی مجبوریوں اور قدروں کو سمجھنا ہے۔انسان کی بلندیوں ، پستیوں، الم ناکیوں، طرب آفرینیوں اور رویّوں سے آگاہی دلانے کے لئے ہی ادب تخلیق کیا جاتا ہے......ساجد خان نے ان افسانوں میں ادب کی مندرجہ بالا قدروں کو کہیں بھی پامال نہیں ہونے دیا۔ساجد خان کا موضوع ہماری معاشرتی زندگی سے اُبھرتے ہوئے اور سلگتے ہوئے معاشی و معاشرتی مسائل کا حسنِ ادراک ہے۔اِن افسانوں میں انہوں نے اپنے تجربے، مشاہدے اور عمیق مطالعے کی روشنی میں جیتے جاگتے کرداروں کو زندگی کے مختلف رنگوں کی صورت میں اُجاگر کیا ہے۔بعض مراحل پر وہ اپنے قاری سے روبرو مخاطب ہیں تو بعض واقعات وحادثات کو بلا تبصرہ اور بلاواسطہ جیسا دیکھا ویسا ہی پیش کر دیا ہے۔

ساجد خان بنیادی طور پر کہانی سنانا چاہتے ہیں لیکن کہانی کہنے میں جس ٹریٹمنٹ سے کام لیتے ہیں وہ اسے افسانہ بنا دیتا ہے۔ ان کے افسانوں میں "کہانی" پر زور ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یہ کہانیاں روایتی کہانیوں سے مختلف نہیں ہیں۔ چیزوں، افراد اور کیفیتوں کو محسوس کرنے کا اِن کا انداز اور روّیہ چونکہ جدید ہے اس لئے ان کے افسانے جدید حسیت کے حامل ہیں۔

ساجد خان کے یہ افسانے اگرچہ بیانیہ انداز میں ہیں مگر یہ بیانیہ سپاٹ اور سطحی نہیں بلکہ اس میں تہہ داری اور رمزیت کی چاشنی بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اکثر افسانوں میں فلیش بیک کی تکنیک کو بھی برتا گیا ہے کہ بیانیہ کے تسلسل میں کسی طرح رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں افسانہ، کہانی کی فنی صورت کا نام ہے۔ وہ "اینٹی سٹوری" کی جدید روش کو نہیں اپناتے اور نہ ہی نئے نئے تکنیکی تجربوں کے شوق میں ان افسانوں کو چیستاں بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دور میں جنس اور رومان سے بچ کر معیاری افسانہ تخلیق کرنے والوں کے شدید بحران میں ساجد خان ایک خوشگوار جھونکا ہے۔ ادب کے سنجیدہ قاری کو ساجد خان کی صورت میں ایک اور اچھا افسانہ نگار مبارک ہو۔

احمد جاوید

ساجد خان کی کہانیوں کے واقعات اُن چنگاریوں کی طرح ہیں جو ایک بڑے الاؤ سے اٹھتی ہے...... بہت بلند ہوتی ہیں ...... سب کو نظر آتی ہیں مگر پھر راکھ بن کر سروں پہ آ گرتی ہیں۔ ہم جس سماج میں رہتے ہیں اُس میں المیے اور سانحات کئی اسباب سے پھوٹتے ہیں اور ہم اپنی بے خبری، معصومیت، بے بسی اور لاچارگی کے باعث اُن کا شکار بن جانے کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ کبھی کوئی المیہ حیطۂ غیب سے متشکل ہوتا ہے اور مقسوم کہلاتا ہے اور کبھی سماجی معاشرتی ناانصافیوں کا شاخسانہ بن کر سامنے آتا ہے اور دُنیا تاریک کر جاتا ہے۔ ساجد خان نے عام طور پر اپنی بیشتر کہانیوں میں انہی المیوں اور سانحات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ نہایت سنجیدگی اور دردمندی کے ساتھ اپنے گرد و پیش کو دیکھا ہے اور حقائق کو جیسا وہ ہیں بغیر کسی لگی لپٹی کے من و عن ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ ان میں سے اکثر کہانیوں کا اختصاص ان کا اختصار ہے۔ وہ مختصر لکھتے ہیں مگر کہانی اپنا

دائرہ ضرور مکمل کرتی ہیں۔اسلوب میں بھی سادگی اور خلوص کی آمیزش ہے جو تفہیم کو سہولت بہم پہنچاتی ہے۔ساجد خان اردو افسانے میں گذشتہ برسوں میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں سے ہرگز متاثر نہیں ہوئے جو خوش آئند بات ہے۔توقع رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی روایت خود پیدا کریں گے اور اسی سے ان کے مقام کا تعین ہوگا۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد وسیم انجم

گذشتہ صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں مختصر افسانہ لکھنے کا انداز داستانی اور محسوساتی تھا۔پریم چند کا پہلا افسانہ''دنیا کا سب سے انمول رتن''۱۹۰۷ء میں ''زمانہ''میں شائع ہوا اور پریم چند ہی پہلا کہانی کار تھا جس نے جلد ہی داستانی، رومانی اور ادبِ لطیف جیسی فنی نثر سے رُخ موڑا اور حقیقت نگاری کی نئی راہ دریافت کرتے ہوئے افسانے کو معاشرتی مسائل سے روشناس کرایا تو افسانوی ادب اُس دور کا نقیب بن گیا اور وہی ادب ابدی حیثیت اختیار کرتا ہے جو قارئین کو متاثر کرے۔ ایسا ادب تخلیق کرنے والے معاشرے کے نئے اور اچھوتے مسائل کو اجاگر کرتے ہیں مثلاً آج کل دہشت گردی نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ہمارے ملک میں دہشت گردی سے بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ لوڈ شیڈنگ نے انسانی زندگی اور صنعتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔معاشی مسائل نے معاشرتی مسائل کو جنم دیا ہے اور خانگی مسائل نے بھی زندگی اجیرن کر دی ہے۔یہ مسائل انسانی زندگی کو دیمک کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ساجد خان کی کہانیاں ایسے ہی مسائل کی نہ صرف نشاندہی کرتی ہیں بلکہ ان کا حل بھی پیش کرتی ہیں اور ساجد خان کو بے رحم ہاتھوں، روایات واقدار کے نیست و نابود ہونے کا شدید قلق ہے۔ساجد خان نے''مجھے روشنی چاہیے''میں تہذیب و تمدن کی مٹتی ہوئی نشانیوں اور ذہنوں سے فراموش ہوتے ہوئے ماضی اور زندگی سے منہ موڑ لینے والی دھندلاتی تصویروں کی نقاب کشائی سے آئندہ نسلوں تک ایسے ہی کارہائے نمایاں پیش کیے گئے ہیں۔اس نے اس کتاب میں قاری کے سامنے معاشرتی و تمدنی تصورات، عادات و اطوار، طرزِ احساس اور زندگی گزارنے کے آداب پیش کیے

ہیں ۔" مجھے روشنی چاہئیے" کا مطالعہ کرنے سے معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کا پتہ چلتا ہے اور معاشرے کو درپیش مسائل کا ادراک بھی ہوتا ہے ۔یہ کہانیاں ایسی سحر آفرین تصاویر پیش کرتی ہیں جو ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں اور ہمیں اپنے گردوپیش میں گھومتی اور سانس لیتی محسوس ہوتی ہیں ۔دراصل ساجد خان کی تخلیقی کاوشوں نے معاشرے کو فکری اعتبار بخشا ہے۔ساجد خان نے ان کہانیوں کو جدید افسانوی رنگ میں پیش کرنے کی ایک ایسی شعوری مگر کامیاب کوشش کی ہے کہ افسانے پر بھی حقیقت کا گمان ہوتا ہے ۔جس کی مثال موبائل فون کی قباحتیں اور دہشت گردی کے ناسور جیسے موضوعات کے چناؤ اور فنی مہارت سے کہانی کی سہل بنت کاری اور مسائل کی نشاندہی سے دی جاسکتی ہے جو آج کل کے نوجوانوں کے لئے سبق ہے۔ساجد نے عام فہم زبان استعمال کر کے قاری تک اپنے پیغام کے ابلاغ کو آسان تر بنا دیا ہے ۔درحقیقت ساجد خان نے ان کہانیوں کے ذریعے آج کے نوجوانوں کو نا اُمیدی کے کفر سے نکالنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ خاصے کامیاب بھی نظر آتے ہیں ۔وقت کے ساتھ ساتھ ان کے مشاہدے اور مطالعے میں وسعت آئے گی جو انہیں بڑے ادباء کی صف میں لے جائے گی ......انشاءاللہ !

پروفیسر ڈاکٹر روشن آرا راؤ

راکھ تلے دبی چنگاریوں اور دہکتے کوئلوں کی طرح گردوپیش کے مسائل کہانیوں اور افسانوں کا موضوع بنتے رہتے ہیں ۔آج بھی افسانوی ادب میں ایسے ہی سلگتے مسائل کو موضوع بنایا جاتا ہے۔"مجھے روشنی چاہئیے" معاشرے میں بکھرے ایسے ہی مسائل کی روداد ہے۔شاید اس لئے کہ ہماری معاشرتی زندگی انہی سے تعبیر ہے۔جو افرادِ معاشرہ کے قلب ونظر میں ہلچل مچاتی ،کرب میں مبتلا کرتی بیرونی ماحول کو شکست خوردہ بنا دیتی ہے ۔ترقی پذیر اور زوال آمادہ معاشروں میں ایسے تہہ در تہہ مسائل انسانی زندگی کو پستیوں میں دھکیلتے ہیں ۔جہاں معاشرتی زندگی کی بھول بھلیوں میں انسانیت دم توڑتی محسوس ہوتی ہے ۔یہاں بوسیدگی سے نڈھال انسانیت داغ دار اور روبہ زوال ہے ۔معاشی واقتصادی ناہمواری ،سیاسی جوڑ توڑ اور باہمی کشمکش نے بلندیٔ فکر وکردار ،احساس

ذمہ داری اور قانون کی پاسداری اور بالادستی کو قصہ پارینہ بنا دیا ہے۔اصول وضوابط سے تہی دامن معاشرے میں ہر طرف ہر طرح کے انتشار، بے چینی اور نفسیاتی کشمکش ڈیرے ڈالے ہے۔آج کا لکھاری کرب والم کے ایسے ہی موضوعات پر خامہ فرسائی کرنے پر مجبور ہے۔اس کا قلم جب بھی اٹھتا ہے ایسی ہی تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ساجد خان کی کتاب ''مجھے روشنی چاہیے'' میں شامل افسانہ ''آکاش'' ایسی ہی کسمپرسی کی داستان ہے جس کا موضوع غربت ہے۔''جناب میرے پاس جوتے نہیں تھے......امی نے کہا جب ابا آئے گا تو خرید کر دے گا......اور میں چار روز تک ابا کی راہ ہی تکتا رہا......استاد نے آکاش کے چہرے سے نظریں ہٹا کر پاؤں کی جانب دیکھا تو آکاش نے پرانے سے زنانہ چپل پہن رکھے تھے جن میں اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں گویا مسکرا رہے تھے'' ۔(آکاش......)۔خودکش حملوں کی زد میں کئی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔کتنے گھروں کے چراغ بجھ گئے ہیں، کتنی امیدیں ناامیدی میں بدل گئی ہیں۔معاشرتی زندگی تہہ وبالا ہے۔اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔''سوی'' اپنے اندر ایسی ہی داستان سمیٹے ہے۔افسانہ ''اثاثہ'' والدین کا اپنی ذاتی ضروریات اور خواہشات کی قربانی دے کر اولاد کی تعلیم تربیت کے معاشی ومعاشرتی مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔لوگ غربت سے گھبرا کر افرادِ خانہ کی مالی معاونت کے لئے پاکستان کے کونوں کھدروں سے نکل کر بیرون ملک پہنچ جاتے ہیں۔اپنوں کی یادوں کو سینے میں دفن کئے سال ہا سال وطن سے دُور رہتے ہیں۔''آخری اڑان'' میں ایک ایسے ہی شخص کے اندرونی احساسات کو زبان دی گئی ہے۔جہاں ایک طرف روپے، درہم، پاؤنڈ اور ڈالر کے عوض دُوریاں خرید لی جاتی ہیں اور دوسری طرف اس کے شب وروز محنت و مزدوری میں گزر جاتے ہیں۔افسانہ ''اُس پار'' میں پاک وہند کی تقسیم کے بطن سے پھوٹنے والے المیے کو بیان کیا گیا ہے۔زندگی اور موت ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں۔غربت امارت میں جنگ رہتی ہے۔صحت بیماری پر طنز کرتی ہے۔بیمار صحت مند کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔امیروں کے لئے بستر کمخواب ہوتے ہیں اور یوں تضادات سے زندگی معمور ہے۔معاشرے

میں ہلچل ہے۔نیکی اور بدی ہے۔تنہائی اور ہنگامے ہیں۔قہقہے اور مایوسیاں ہیں۔غربت وافلاس اور پیسے کی ریل پیل سے سماجی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ جیسے موضوعات ساجد خان کے اکثر افسانوں میں شامل ہیں۔اسی طرح دولت زندگی کے معیار اور رشتوں کو کس طرح متاثر کرتی ہے۔موبائل فون کی قباحتیں، اپنوں کی عدم توجہ اور مکافاتِ عمل جسے موضوعات کو بھی ساجد خان نے بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔مالی نقصان انسان کا دماغ خراب کردیتا ہے۔کہیں اپنوں کی عدم توجہ سے جینے میں حسن نہیں رہتا" پاگل" اسی موضوع کی تفسیر ہے۔غربت اور جہالت میں پروان چڑھنے والی جوانی کے انداز" نشانی" میں نمایاں ہیں۔جائیداد کی تقسیم کسی کو اونچا کردیتی ہے اور کسی کو بے یار ومددگار...... "سبکدوش" میں یہی کچھ ہے......زندگی کا ایسا ہی چلن" گھروندا" میں نظر آتا ہے۔یتیموں اور مساکین کی املاک پر قبضہ گروپ عیش کرتے ہیں اور نمود ونمائش کے لئے مسجدیں اور مدرسے تعمیر کرتے رہتے ہیں۔"مٹھائی" میں ایسے ہی بھیانک چہروں سے نقاب کشائی کی گئی ہے۔معاشرے کے مسائل کی روداد "مسکراہٹ" میں ہے۔جس میں سیاستدانوں کا مکروہ چہرہ اور کارگزاریاں بے نقاب کی گئی ہیں۔اس کتاب میں شامل ساجد خان کے افسانوں اور کہانیوں میں معاشرہ میں بکھرے مسائل کی روداد ہے۔بہت سادہ اور عام فہم زبان لیکن بعض مقامات پر زبان کی لطافت، گہرائی اور گیرائی کی تلاش میں قاری تشنگی کا شکار ہونے لگتا ہے۔فقرات کی دروبست میں الفاظ کا چناؤ خصوصی اہمیت کا متقاضی ہے جسے عمیق مطالعہ سے منفرد اُسلوب میں ڈھالا جاسکتا ہے......تاہم ابتدائی کوشش میں اُمید کی بہت سی کرنیں موجود ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیان صفی

افسانے کے تین چار بنیادی لوازمات ہوتے ہیں جن میں کہانی، کردار، تہذیب اور روایت سے ہم آہنگی اور اسلوب بیان شامل ہیں......ساجد خان کے افسانوں میں یہ لوازمات بدرجہ اتم موجود ہیں......دوسری اہم بات اس کی کہانیوں میں ہزارہ اور بالخصوص حویلیاں کے مضافات کی تہذیب ومعاشرت کے تمام عکس جھلملاتے ہیں......اس نے اپنی کہانیوں کے کردار اور ان کرداروں کے

مسائل اپنے گردوپیش سے ہی اخذ کئے ہیں۔اپنی سرزمین اور گردوپیش کے مسائل کا شعور اور ادراک بھی کسی اچھے لکھاری کی پہچان ہوتا ہے......ساجد خان نے بلاشبہ اپنی روایت،تہذیب اور ماحول سے کہانیاں کشید کی ہیں۔میں اس تصنیف پر ساجد خان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر یحیٰی خالد

مجھے آج انتہائی خوشی اور فخر محسوس ہو رہا ہے کہ میرے اپنے علاقے یعنی حویلیاں سے تعلق رکھنے والے ایک افسانہ نگار کی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے...... میں نے بھی افسانے لکھے، چھاپے اور انہیں لوگوں نے پسند بھی کیا......لیکن میں نے ہندکو زبان کو ذریعہ اظہار بنایا تھا......ساجد خان نے اردو زبان میں افسانے لکھ کر اس میدان میں اولیت حاصل کر لی ہے۔لکھنے سے پہلے مطالعہ بھی انتہائی ضروری ہے میں ساجد خان کو معاصر ادب کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے کی ہدایت کرتا ہوں تاکہ وہ ہم عصر ادب سے بھی آگاہ رہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تحریر میں نکھار اور اسلوب میں برجستگی بڑھے۔اس کا مشاہدہ بڑھے گا تو اس کی تحریر میں اثر بھی پیدا ہوگا۔ساجد خان میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں اور میں دعا گو ہوں کہ اس کا بہت جلد معروف افسانہ نگاروں میں شمار ہو۔

جان عالم

یہ ایک فکری مغالطہ ہے کہ کہانی فرضی ہوتی ہے۔کہانی حقائق سے جنم لیتی ہے اور حقائق کا اصل جوہر کہانی میں پنہاں ہوتا ہے۔کہانی کے بغیر حقائق بے حقیقت ہیں۔سنسان راستہ............دھوپ..................دھوپ میں پتھر توڑنے والا مزدور..............لمبی سیاہ گاڑی......اور اس میں بیٹھا امیر زادہ..............اور گاڑی کے بند شیشوں پر جھپٹتے بھوکے بچے..............!!یہ سب ہمارے اردگرد بکھرے حقائق ہیں۔لیکن ان کا اصل جوہر حقائق کے پیچھے اُن کہانیوں میں ہے جن پر عام انسان کی نظر نہیں پڑتی۔اسی لئے یہ سارے حقائق ہمارے لئے بے حقیقت ہوتے ہیں۔ہم روز یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور بھلا دیتے ہیں۔ہم ان کے بطون میں

چھانک نہیں سکتے ۔اُن کہانیوں کو سن نہیں پاتے جو ان حقائق کا اصل ہیں ۔

ایسا کیوں ہے؟ ایسا اسلئے ہے کہ ہمارے پاس کہانی سنانے والا موجود نہیں ہوتا ۔کہانی کار نہیں ہوتا ۔حقائق کی اصل حقیقت دکھانے والا نہیں ہوتا ۔

ساجد خان ایک ایسا ہی کہانی کار ہے جو اپنے اردگرد دبکھری تلخ و شیریں حقیقتوں کے پردے چاک کرتا ہے اور اُن میں چھپی کہانیاں ہمیں سناتا ہے ۔کہانی سن کر سونے والوں کی اپنی کہانی ہے ......

......مگر کہانیاں نیندیں اُڑا بھی دیتی ہیں ۔کہانیاں حقائق میں تغیر لا سکتی ہیں ۔ایسا تغیر جو نئے حقائق اور نئی کہانیوں کے جنم کا سبب بنتا ہے ۔

اللہ کرے ساجد خان کی کہانیاں قاری کو سلانے کی بجائے اُن کی نیندیں اُڑادیں اور کہانی سننے والا اپنے اردگرد بکھرے حقائق سے سرسری نہ گزرا کرے ۔ہم ساجد خان اور ان جیسے دوسرے کہانی کاروں سے یہی توقعات رکھتے ہیں ۔ساجد خان !......آپ کو یہ کٹھن سفر مبارک ہو ۔

ڈاکٹر کاشف بٹ

ساجد خان وہ کہانی کار ہے جو کائنات کی کوکھ سے کہانی کشید کرتا ہے ۔وہ مرتی ہوئی انسانیت کو اپنی کہانی میں ایک نئے جنم کی بشارت دیتا ہے اور یہی فن اُسے تخلیق کار کے منصب پر فائز کرتا ہے ۔ساجد خان جو کردار تخلیق کرتا ہے ان میں اپنے تخیل سے ایسے رنگ بھرتا ہے جو کبھی پھیکے نہیں پڑتے ۔وہ معاشرے کے ننگے کرداروں کو اس فنکاری سے لبادے اوڑھاتا ہے کہ کہانی کو عریانیت سے بھی صاف بچا لیتا ہے اور کرداروں کے عوامل کی کارفرمائی بھی ظاہر ہو جاتی ہے ۔

زندگی اس کے افسانوں میں اپنے ہر رنگ کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے ۔موسموں کا تغیر اور گردشِ حالات اس کے افسانوں میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں ۔وقت کروٹ بدلتا ہے تو حادثات اور سانحات تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں اور جب ساجد خان کا قلم کاغذ پہ زاویے بدلتا ہے تو سماج کے اتار چڑھاؤ افسانوی ادب کا حصہ بن جاتے ہیں ۔بدلتے وقت کی پرچھائیاں انسانیت پہ جو اثرات مرتب کرتی ہیں انہیں ساجد خان نہایت دلکش انداز میں ادب کی مالا میں پروتا ہے ۔اس نے زندگی کو بہت

قریب سے دیکھا ہے اور وہ اسی زندگی کا تجزیہ اپنے افسانوں میں کرتا ہے۔

محمد اسفر آفاقی

آج کا انسان حالات کے دھارے پر تنکوں کی طرح بہے جا رہا ہے۔ یہ ایک واشگاف حقیقت ہے کہ انقلاب زمانہ کی ستم ظریفیوں سے کوئی بھی فرد نہیں بچ پاتا۔ کائنات کے سبھی رنگ انسانی حیات سے ہم آہنگ ہیں۔ یہ رنگ کبھی چھلکتے آنسوؤں میں جھلکتے ہیں اور کبھی سسکیوں اور آہوں میں مچلتے ہیں۔ زندگی کا کارواں کہیں رُکتا نہیں۔ زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ چیزیں معدوم ہو جاتی ہیں اور نئی دُنیا کے ساتھ نئے حالات اور نقشے سامنے آجاتے ہیں۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ انسانی المیوں کے وقوع پذیر ہونے کے عمل اور عہد میں ہی کہیں ہمارے آس پاس ایک ایسا تخلیق کار بھی ہوتا ہے جو ان تمام المیوں کو اپنے دِل پہ سہتا جاتا ہے اور پھر انہی المیوں اور رویوں کو وہ اپنی تحریروں کے ذریعے باقی کے تمام انسانوں کو دکھاتا ہے۔ ایسے تخلیق کار کو عرف عام میں ہم افسانہ نویس یا کہانی کار کہتے ہیں۔ ساجد خان بھی اسی صف کا ایک جینوئن تخلیق کار ہے۔ جو ایک مختصر عرصے میں بطور افسانہ نویس اور کہانی کار اپنی شناخت اور مقام بنا چکا ہے۔ ساجد خان کے مشاہدے کی حس عام لوگوں کی بہ نسبت بہت تیز اور عمیق ہے۔ جو اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتا ہے اور جس زاویے سے دیکھتا ہے وہ اسے اپنے قارئین کے سامنے اسی انداز اور زاویے سے پیش کر دیتا ہے...... اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی نظر آتا ہے۔ کوئی منظر یا واقعہ جب اس کے ذہن کے کینوس پر اترتا ہے تو وہ اسے ردِ عمل کے طور پر کہانی یا افسانے کے روپ میں ڈھال کر پیش کر دیتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل چند لمحوں پر بھی محیط ہو سکتا ہے اور اس میں کئی دن بھی لگ سکتے ہیں۔ ساجد خان نے اس معاملے میں بھی زرخیزی پائی ہے۔ وہ پوری کائنات کے غموں کی شدت کو اپنے اندر محسوس کرنے والا تخلیق کار ہے۔

راشد خان جدون، پراجیکٹ کوارڈینیٹر سپارک

ساجد خان سے میرا تعلق سکول کے زمانے سے ہے۔ بچپن سے ایک ہی شہر، ایک ہی سکول اور کالج میں ہونے کی وجہ سے ساجد خان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے مجھے واقفیت ہے۔ عرصہ

دراز سے ساجد خان مختلف اخبارات، رسائل اور ادبی محفلوں میں اپنے مضامین اورتحریروں کے ذریعے لکھنے لکھانے کے شوق کی تکمیل میں کوشاں ہے۔دوست احباب میں اس کا تعارف ایک کالم نویس کے طور پر تو تھا ہی لیکن ایک دن ساجد خان نے بتایا کہ اس کے افسانوں کی ایک کتاب جلد منظرِ عالم پر آرہی ہے۔ہمیں تو یقین ہی نہ آرہا تھا کہ عام ماحول میں رہنے والا نوجوان اپنی تحریر کو کتابی شکل میں بھی لا سکتا ہے لیکن اس دن میری خوشی دوچند ہو گئی جس دن میں نے اخبار میں پڑھا کہ ساجد خان کے افسانوی مجموعے"مجھے روشنی چاہیئے" کی تقریب رونمائی منعقد ہو رہی ہے۔میں نے فوری ردِعمل کے طور پر ساجد خان کو فون پر مبارکباد دی اور کتاب کا مطالبہ کر دیا جو اس نے اسی روز پورا بھی کر دیا۔جب میں نے اس کی کتاب "مجھے روشنی چاہیئے" کا انتہائی اشتیاق کے ساتھ مطالعہ کیا تو مجھے کتاب کی سطر سطر میں حقیقی زندگی کے بہت سے روپ جھلملاتے نظر آئے۔

میرا تعلق چونکہ بچوں کے بنیادی حقوق اور مسائل سے متعلق ایک این جی او"سپارک" سے ہے اس لئے میں نے جب کتاب کو دوسری بار پڑھا تو مجھے ساجد خان کا افسانہ"چھوٹے" بہت پسند آیا۔ اس افسانے میں ساجد خان نے جس انداز سے غربت، معاشی مسائل اور بچوں سے مشقت لینے کی منظر کشی کی ہے وہ بے حد متاثر کن ہے۔ دیگر افسانوں میں بھی وہ عام زندگی کے مسائل و معاملات کو جس کرب، درد اور محنت سے اُجاگر کرتا ہے وہ قاری کی مکمل توجہ حاصل کر لیتے ہیں۔میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے دوست کو اپنے علم کے خزانوں سے مالا مال کرے۔

قاضی محمد ارشد

مصنف عوام الناس کے ترجمان اور قوموں کی ثقافت کے محافظ ہوتے ہیں۔ساجد خان نے اپنے افسانوی مجموعے"مجھے روشنی چاہیئے" میں اپنے گردوپیش میں بکھرے مسائل اور عوام کے خیالات و حالات کی صحیح معنوں میں ترجمانی کی ہے۔یہ ایک اچھی کوشش ہے۔اس کے علاوہ اس مجموعے میں لوگوں کے مسائل کی نہ صرف نشاندھی کی گئی ہے بلکہ ان کے حل کے لئے بھی لوگوں کے شعور کو

بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''مجھے روشنی چاہیئے'' معاشرے میں بکھرے مسائل کو روداد ہے۔کتاب پڑھنے سے معاشرے کے سلگتے ہوئے مسائل اوران کے منفی اثرات کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے.....اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

خاکسار نثار احمد

انسانی سوچ کی تبدیلی اورانداز فکر کی ترویج میں قلم کا بنیادی کردار ہےاور قلم کی طاقت کو اللہ نے قرآنِ کریم میں ایک آیت میں اس کی قسم کے ساتھ بیان کیا ہےاوراسی قلم کے صحیح یاغلط استعمال سے قومیں اتحاد اور افتراق میں بدل جاتی ہیں۔آج کے دور میں بہترین قلمکار کوادیب،شاعر،کالم نگار،کہانی نویس اورافسانہ نگار کے روپ میں دیکھا جاتا ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ ہر انقلابی شاعراورلیڈر نے اپنی سوچ اورفکر کوقلم کے ذریعے جب صفحۂ قرطاس پر رکھاتو قومیں بکھرے دانوں سےایک تسبیح کی صورت اکٹھی ہوگئیں۔ہرادیب، شاعراورنثر نگار نے اپنے طور پر اپنے گردوپیش کےانسانوں کی بہترین انداز میں رہنمائی کی کوشش کی ہے۔انہی شخصیات میں آج کےنوجوان افسانہ نگاراورکالم نویس جناب ساجد خان جدون کا شمار بھی ہوتا ہےجنہوں نے موجودہ حالات وواقعات کےتناظر میں ناصرف اپنے کالموں کےذریعےنئی فکر دینے کی کوشش کی بلکہ ادب کی مشکل ترین صنف افسانہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی اور ملک کےنامورافسانہ نگاروں سے دادوتحسین حاصل کی۔ساجد خان کے پہلےافسانوی مجموعے''مجھےروشنی چاہیئے''کوجس انداز میں پذیرائی ملی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مستقبل میں ساجد خان ایک نامورلکھاری بن کرحویلیاں میں پنپنےوالےافسانوی ادب کا سپہ سالار بنے گا۔اس وقت پاکستان کے پچانوے فیصدعوام جس کرب میں زندگی گزار رہے ہیں۔فکرِمعاش نے جہاں ہرشخص کواپنے حصار میں لےرکھا ہےاس دور میں تسکینِ قلب کی بات کرنا،خدمتِ انسانی کاجذبہ بیدار کرنا،بچوں اورصنفِ نازک کے حقوق کی تبلیغ کرنااورمزدورکی عظمت کواجاگر کرنااورقوم اورنوجوان نسل کی سوچ کواپنے قلم کےذریعےتخریب سےتعمیر کی طرف موڑنا واقعتاًایک عظیم اورمشکل کام ہےلیکن ساجد خان جیسے ہی کسی شاعراورادیب نے کہاہے کہ:

اگر ہے جذبہ تعمیر زندہ　　　　تو پھر کس چیز کی کمی ہے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ساجد خان جیسے نئے لکھاریوں کے قلم اور سوچ میں بے پناہ تاثیر ڈالے کیونکہ ہمیں اس وقت اچھی اور تعمیری سوچ رکھنے والے انسانوں کی ہی ضرورت ہے۔

ملک عرفان خانی ......سابق ناظمِ اعلیٰ حرف اکادمی پاکستان

ساجد خان کے افسانوں کے مجموعے ''مجھے روشنی چاہیئے'' میں ۲۲افسانے اور کہانیاں شامل ہیں۔ ان افسانوں میں ساجد خان نے نظریاتی سطح پر ایک منجھے ہوئے تخلیق کار کی طرح عصرِ حاضر کے مسائل کا حقیقی روپ دکھایا ہے۔افسانے اور کہانیوں کا جس انداز اور روپ میں کسی تخلیق کار پر نزول ہوتا ہے نقاد حضرات بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں مگر ساجد خان نے ''جواز'' کے نام سے اس تجربے کو انتہائی خوبصورت انداز میں تحریر کا لبادہ پہنایا ہے......جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ''مجھے روشنی چاہیئے'' کا مصنف اس دعا کا مزید طلب گار ہے ......میرا مطلب ہے ''رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا'' ......اور علمی دانش رکھنے والا انسان اس طرح کی دُعا سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔

ساجد خان کے افسانوں اور کہانیوں کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس کہانی کو ہم نے ادھورا چھوڑ دیا تو بہت سے خوبصورت مناظر دیکھنے سے محروم رہ جائیں گے۔نامور افسانہ نگار جناب شعیب خالق ایک افسانے میں یوں پیرا گو ہیں کہ ''ارتعاش کی اپنی کوئی تصویر نہیں ہوتی بلکہ یہ جو کچھ اُگلتا ہے اس میں تصویریں ہوتی ہیں''۔اسی طرح میں یہ کہتا ہوں کہ تخلیق کی اپنی کوئی تحریر نہیں ہوتی بلکہ تخیل میں جو ابھرتا ہے اس میں تحریریں ہوتی ہیں۔

یقیناً ساجد خان نے اپنے تخیل کی پرواز میں اُبلتے دریا کا ہر ایک قطرہ ''مجھے روشنی چاہیئے'' میں مقید کر دیا ہے۔جسے پڑھنے کے بعد آپ لوگ میری رائے سے نہ صرف اتفاق کریں گے بلکہ اس مجموعے کی پذیرائی میں اپنے حصے کی داد بھی ضرور ڈالیں گے۔

محمد بشیر رانجھا

ساجد خان کے افسانوں کی فنی خوبی یہ ہے کہ وہ سلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ غور و فکر کا عادی ہے۔ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں نے اسے حساس بنادیا ہے اور وہ غلاظتوں کی نشاندہی کرنے پر قادر ہے۔ ساجد خان تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ اُس کا ذہن فلسفیانہ ہے اور وہ انسانی کمزوریوں کا ادراک بھی رکھتا ہے۔ وہ مسائل کا فلسفیانہ تجزیہ کرنا جانتا ہے جو اس کی فن کاری کا مثبت اور روشن پہلو ہے۔ اس کے ہاں الفاظ کے بہاؤ اور خیالات کی روانی میں تیزی و تندی ہے ...... وہ جذبات کی رو میں بہت دُور تک نکل جاتا ہے جو اس کی فنِ افسانہ پر دسترس کا ایک واضح ثبوت ہے۔

ساجد خان ہمارے عہد کا ایک ایسا افسانہ نگار ہے جو روایت شکن بھی اور روایت ساز بھی۔ وہ اظہار اور موضوعات کی ترسیل کے معاملے میں "گائیڈڈ میزائل" کا ہمسفر نہیں۔ اس کا فکری بہاؤ اور جذباتی تحرک متعین منزل پر پہنچنے کے بجائے تخیل اور تجربے کے کھلے میدانوں میں صحرائی ریت کی مانند شش جہت میں پھیلتا نظر آتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ اس کا اپنا کوئی ویژن نہیں ...... وہ ہر شے، واقعے، تجربے، واردات اور معاملے کی تہوں میں اتر کر حقائق اور اصلیتوں سے ایسی صورتیں اجاگر کرتا ہے جنہیں دیکھ کر قاری نتائج اور مقاصد تک از خود پہنچنے کی سبیل ڈھونڈ لیتا ہے۔

ساجد خان

(دائرے کا اسیر)

ساجد خان کے ہاں تکنیکی تنوع موجود ہے جس کی بدولت وہ خارجی مظاہرِ فطرت کے ساتھ لاشعوری اور تحت الشعوری مظاہر کو بھی سہولت کے ساتھ کاغذ پر اتار لیتا ہے۔اس کے افسانوں میں باطن کا سفر ایک نئے صوفیانہ آہنگ کی پہچان کراتا ہے۔اس کا کمال یہ ہے کہ وہ تکنیکی ندرت کے ساتھ مشکل ترین مرحلوں سے باسہولت گزر جاتا ہے۔ساجد خان کی لفظوں پر گرفت بھی خاصی مضبوط ہے اور وہ کہیں بھی افسانوی ادب میں نووارد ہونے کا تاثر نہیں چھوڑتا۔

اس کے بعض افسانوں کی قرأت کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ ایک ایسا تخلیقی فنکار ہے جس نے علوم اور علم کے ضابطوں کی حدود سے بہت آگے نکل کر اُن رمز بھرے حقائق کو گرفت میں لیا کہ جن پر دسترس حاصل کرنا ہر لکھنے والے کا نصیب نہیں ہوتا۔اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اُس نے افراد کے جن ابنارمل رویوں کو پیش کیا ہے ان میں سے چند ایک ایسے نازک رویے ہیں کہ جو ابھی تک نفسیات کی اصطلاحوں کی گرفت میں نہیں آسکے۔......اللہ کرے زرِ قلم اور زیادہ

ڈاکٹر رشید امجد

ساجد خان کے افسانوں کی فنی خوبی یہ ہے کہ وہ سلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ غور و فکر کا عادی ہے۔ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں نے اسے حساس بنا دیا ہے اور وہ غلاظتوں کی نشاندہی کرنے پر قادر ہے۔ساجد خان تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا گہرا شعور رکھتا ہے۔اُس کا ذہن فلسفیانہ ہے اور وہ انسانی کمزوریوں کا ادراک بھی رکھتا ہے۔وہ مسائل کا فلسفیانہ تجزیہ کرنا جانتا ہے جو اس کی فن کاری کا مثبت اور روشن پہلو ہے۔اس کے ہاں الفاظ کے بہاؤ اور خیالات کی روانی میں تیزی و تندی ہے......وہ جذبات کی رو میں بہت دُور تک نکل جاتا ہے جو اس کی فنِ افسانہ پر دسترس کا ایک واضح ثبوت ہے۔

(محمد بشیر رانجھا)

انتخاب (نمائندہ افسانے)

☆......جواز ...... (دیباچہ: مجھے روشنی چاہیے)

☆......مجھے روشنی چاہیے ...... (افسانہ)

☆......دائرے کا اسیر ...... (افسانہ)

جواز

کافی دنوں سے جاری بارش اور شدید سردی کی وجہ سے گھر سے باہر نکلنا محال ہو رہا تھا۔آج موسم نسبتاً کچھ صاف تھا تو میں چہل قدمی کے لئے گھر سے باہر نکل پڑا۔گھر واپس لوٹتے ہوئے میں نے اسے گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے دیکھا۔وہ مجھے گھور رہی تھی۔میں نے دانستہ اس سے نظریں چرائیں اور کترا کے آگے نکلنا چاہا......تھوڑی دور جا کر غیر ارادی طور پر میں نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ مجھے ہی تکے جا رہی تھی۔میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔چند قدم چلنے کے بعد میں نے لاشعوری طور پر محسوس کیا کہ جیسے وہ میرا تعاقب کر رہی ہے۔میں بچوں کے لئے چند چیزیں لینے کے لئے کچھ دیر تک ایک دکان کے اندر چلا گیا۔وہاں سے فارغ ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ بازار کی بھیڑ سے الگ تھلک ایک کونے میں کھڑی تھی اور اس کی نظریں مجھ پر ہی مرتکز تھیں......گویا وہ میرے انتظار میں کھڑی تھی۔میں کچھ گھبرا سا گیا۔میں نے تیز تیز قدموں سے گھر کے قریب ترین گلی کا انتخاب کیا۔میں جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔گھبراہٹ اور تیز چلنے کی وجہ سے میرا دل بھی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔میں دھڑکتے دل سے گھر پہنچا اور سودا سلف ایک طرف رکھنے کے بعد ابھی اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔میرے پورے وجود میں ایک سردی لہر دوڑ گئی......کہیں یہ وہی نہ ہو؟......مگر وہ کیونکر ہو گی؟ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا......پھر خود ہی اپنے آپ کو تسلی دی......اگر وہ ہو بھی تو کیا؟

ملحقہ کمرے میں میری بیوی بچوں کے کپڑے استری کر رہی تھی......سامنے کمرے میں بچے کھیل کود میں مگن تھے......ان کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔اوپر سے رہی سہی کسر اونچی آواز میں چلنے والے ٹیلیویژن نے نکال دی تھی۔اتنی دیر میں دوبارہ قدرے زور سے دستک ہوئی۔میں تیزی سے اٹھا اور گھر کا مرکزی دروازہ کھول دیا۔سامنے وہی کھڑی تھی۔اب کی بار اس نے نقاب سرکا رکھا تھا۔میں سرتاپا اس کے سراپے کا جائزہ لینے لگا۔وہ بے حد خوب صورت اور جاذب نظر تھی۔کچھ لمحے تو میں اس کے سراپے میں ہی گم رہا......پھر میرے منہ سے بے اختیار

نکلا۔

جی! آپ؟

ہاں......میں!

پہلے تو میں سمجھا کہ شاید وہ ہماری گلی میں کسی سے ملنے آئی ہے اور گلی میں پہنچ کر گھر بھول گئی ہے...... مگر اس کے بے تکلف اندازِ گفتگو نے مجھے چونکا دیا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟"......میں نے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"جی! مجھے آپ ہی سے ملنا ہے"......اس نے متبسم لہجے میں جواب دیا۔

"مجھ سے؟ مگر میں تو آپ کو نہیں جانتا"......میں نے حیرت سے جواب دیا۔

"آپ سارے سوال جواب دروازے پر ہی کریں گے یا مجھے اندر بھی آنے دیں گے؟"......اس نے پر اعتماد انداز میں آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

میں حیرت سے قدرے پیچھے ہٹ گیا......وہ گھر کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ میں دروازہ بند کر کے جیسے ہی پیچھے مڑا اتنی دیر میں وہ لان سے گزر کر میرے کمرے میں پہنچ چکی تھی۔

میز پر میری کتابیں اور دیگر اشیاء بڑی بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں......وہ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے میری کرسی کے سامنے صوفے پر براجمان ہو گئی۔ میں ابھی تک اس کے بے تکلفانہ اندازِ گفتگو اور بے دھڑک میرے کمرے میں گھس آنے کی حیرت پر قابو بھی نہ پا سکا تھا کہ وہ بولی۔

بیٹھ جایئے......گھبرایئے مت! میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئی ہوں۔

میں اس سے اس کا نام پوچھنا چاہ رہا تھا......اس کی خوب صورتی اور پیکر کو دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں کئی خوبصورت نام بھی سوچے......شائستہ! شگفتہ، گل......کہ اچانک اس نے میرا ہاتھ تھام لیا......

میں اس کے اس اچانک اقدام پر گھبرا سا گیا......میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ساتھ والے

کمرے میں میری بیوی موجود تھی ......سامنے کمرے میں بچے کھیل رہے تھے ......تھوڑی سی گڑبڑ میرے گھر کا سکون اور امن تباہ کرنے کے لئے کافی تھی ......میں نے کرسی سے اٹھنا چاہا تو اس نے میرے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھوں سے دباؤ بڑھا دیا ......میری گھبراہٹ میں دوچند اضافہ ہو گیا ......یا خدایا! یہ کیا ہو رہا ہے؟؟؟ ......اگر میری بیوی نے دیکھ لیا تو گھر میدانِ جنگ بن جائے گا ......اس خیال سے مجھے ٹھنڈے پسینے آنا شروع ہو گئے۔

اُس نے دوبارہ میرا ہاتھ تھاما اور بے محابا میری انگلیاں چومنے لگی ......میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''کیا کر رہی ہو؟ ......ملحقہ کمرے میں میری بیوی موجود ہے'' ......میں نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔

''لگتا ہے آپ اپنی بیوی سے بہت ڈرتے ہیں'' ......وہ بولی۔

''ہر شریف آدمی اپنی بیوی سے ڈرتا ہے ......'' ......میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''بڑے بزدل ہو؟'' ......اس نے ایک دلآویز مسکراہٹ سے کہا۔

''ایسی بات نہیں ......جو کسی سے نہیں ڈرتا وہ اپنی بیوی سے ڈرتا ہے'' ......میں نے قدرے اعتماد سے جواب دیا۔

وہ میری آنکھوں کے رستے میرے دل میں اترے جا رہی تھی۔ میں نے اس ڈرامے کو جلد از جلد ختم کرنے کے لئے اس کے یوں میرے پاس چلے آنے کا مقصد پوچھا۔

''آپ مجھے لکھیں ......میری بات کریں'' ......اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا؟ ......''میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میں چاہتی ہوں ......آپ میرے ہر پہلو پر لکھیں ......اور ایسا لکھیں کہ میرا پیکر لفظ میں سما جائے ......میرے خد و خال اور سراپا نکھر کر قارئین کے سامنے آ جائے ......ایسا لکھو کہ مجھے دیکھے بغیر ہر ایک میرا ہی دیوانہ ہو جائے ......''وہ بے تکان بولے جا رہی تھی ......وہ ایک ایسے پھول کی

مانند تھی جو اپنی ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک کلی پر اظہار خیال چاہتی تھی ۔ میں اس کی گفتگو اور انداز تکلم کو دیکھ کر گویا اس کے جمال کے سحر میں آ چکا تھا ۔

"میں اتنا بڑا لکھاری کہاں ہوں؟" ...... میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا ۔

"جھوٹ ...... سفید جھوٹ! میں آپ کو نہ صرف جانتی ہوں بلکہ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ مجھے آپ ہی الفاظ کے پیکر میں ڈھال میں سکتے ہیں" ...... وہ بڑے اعتماد سے بولی ۔

"دیکھو! یہ کام کوئی بڑا تخلیق کار ہی سر انجام دے سکتا ہے ...... اور ہمارے ملک میں ایسے تخلیق کاروں کی کمی بھی نہیں جو کسی عام سے خیال کو بھی اپنے الفاظ کی قوت اور فنی ریاضت سے ایسے پیکر میں ڈھال سکتے ہیں جسے زمانہ برسوں نہیں بھولتا ۔ آپ کسی اچھے کہانی کار سے ملیں جو یہ کام مجھ سے بہتر انداز میں سرانجام دے سکے" ...... میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا ۔

"میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے قلم کے جادو سے بے جان لفظوں میں ایسی روح پھونکیں کہ میرا حسن و جمال ایک جیتی جاگتی تصویر کے پیکر میں ڈھل جائے" ...... اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ۔

"حسن و جمال کی جیتی جاگتی تصویر ......" ...... میں نے اس کے الفاظ دہرائے ۔

"تم اپنے الفاظ کی جادوگری سے مجھے ایک ایسا آئینہ بنا دو جس میں ہر ایک کو اس کی خواہش اور منشاء کے مطابق میرے حسن و جمال کا عکس نظر آئے" ...... اب وہ منتوں پر اتر آئی تھی ۔

چونکہ مجھے بیوی کے آجانے کا خدشہ بھی لاحق تھا ...... اور اس کے اس بے تکلفانہ انداز سے اکتا بھی چکا تھا ...... لہٰذا میں نے اس کی ہر بات پر ...... ہاں جی، کیوں نہیں ...... انشاءاللہ اور ضرور جیسے الفاظ ادا کر کے اس سے اپنی جان چھڑائی ۔

اس کے چلے جانے کے بعد بیوی نے پوچھا ۔

"کون تھا؟"

میں سوچنے لگا کہ اسے کیا کہوں؟ کیا نام بتاؤں؟

بیوی نے میری محویت کو دیکھ کر ایک آدھ بار اپنا سوال دہرایا مگر کوئی جواب نہ پا کر غصے سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بیوی کے چلے جانے کے بعد میں اس کے سراپے پر غور کرنے لگا......

وہ بے حد خوبصورت تھی......اس کے حسن و جمال کا سحر میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ وہ جب میرے قریب تھی تو میں نروس ہو رہا تھا لیکن اب مجھے وہ اپنے ہی وجود کا حصہ معلوم ہونے لگی تھی ۔ادھر میرا یہ حال تھا کہ میں اس کا نام تک نہ پوچھ سکا۔

''دوبارہ ملاقات پر میں سب سے پہلے اس کا نام پوچھوں گا''......میں سوچنے لگا۔

وہ مجھ سے دوبارہ تنہائی میں ملنے کا تقاضا بھی تو کر رہی تھی......اب میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کی اور میری ملاقات کسی ایسی جگہ ہو جہاں دوسرا کوئی نہ ہو......مکمل سکون اور تنہائی میں اس سے ملاقات کرنا گویا ضروری ہو گیا تھا۔ میں اس کے تصور میں ایسا کھویا کہ کچھ دیر تک میرے بیوی بچے منظر سے غائب ہو گئے ۔اس رات اس نے مجھے بہت بے چین رکھا یہاں تک کہ رات بھر وہ میرے خوابوں پر بھی قابض رہی......اور رات بھی جیسے تیسے گزر ہی گئی۔

صبح ناشتے کی میز پر اخبار کے سر ورق کی شہ سرخی پر نظر پڑی تو میں لرز کر رہ گیا......''ایک خوبرو کا لرزہ خیز قتل''......میں نے غور سے چوکھٹے میں لگی تصویر کو دیکھا تو میں پہلی نظر میں ہی اسے پہچان گیا......یہ تو وہی تھی جو کل مجھ سے ملنے آئی تھی......مگر اسے قتل کیوں کر دیا گیا؟؟

خبر کی تفصیل میں لکھا تھا کہ اسے کل ایک شخص سے ملاقات کی پاداش میں قتل کر دیا گیا......میں ناشتہ چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا......تنہائی میں اس کے قتل کی تمام تفصیلات پڑھنے لگا ۔اسی خبر میں اس کا نام بھی معلوم ہوا......اس کا نام کہانی تھا......وہ کل مجھے ہی ملنے آئی تھی اور بضد تھی کہ میں اسے لکھوں...........میں نے اسے بہت ٹالا......اور آج اسی ادھوری ملاقات کی پاداش میں اس کا قتل ہو گیا۔ مجھے اس ملاقات کی تمام جزئیات یاد آنے لگیں......اس کی باتوں کی سرشاری کے سحر سے میرا دل و دماغ اب بھی معطر تھا۔ خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا......میں نے سامنے میز پر

رکھا قلم اٹھایا ...... قلم اٹھاتے ہی مجھے اس کا میری انگلیوں کے بوسے لینا یاد آ گیا ...... اب پوری بات میری سمجھ میں آ چکی تھی کہ وہ کیوں میری انگلیوں کو چوم رہی تھی۔ میں اس کی یادوں میں کھو گیا ...... جونہی میں لکھنے لگا تو تمام اہلِ قلم کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے آ گئے۔

"مجھے اس پر نہیں لکھنا چاہیے ...... میں اس کا حق ادا نہیں کر سکوں گا ...... مجھ سے انصاف نہیں ہو گا ...... شرمندگی ہو گی ......" بے شمار خیالات تھے ......

"وہ تجھ سے ملنے کی پاداش میں قتل ہوئی ہے ...... اس کی ملاقات صرف تجھ سے ہی ہوئی تھی ...... تمام کہانی کار تم سے بہتر اور اعلیٰ سہی ...... لیکن وہ صرف تجھے ملنے آئی تھی ...... اس لئے تم ہی اس پر لکھنے کا حق رکھتے ہو" ...... میرے دل نے گواہی دی۔

میں نے قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا ...... جیسے جیسے میرے قلم کی روانی اور جولانی میں نکھار آتا گیا ...... اس کا پیکر میرے لفظوں میں سمانے لگا ...... اور بالآخر وہ پورے جاہ و جمال کے ساتھ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی جسے میرے لفظوں نے امر کر دیا۔

....

قارئینِ محترم! یہی میرے الفاظ کہانی کہنے کا جواز ہیں ...... میرے سامنے کہانی جس پیکر اور صورت میں آتی ہے میں اسے اسی شکل اور صورت میں آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں ...... میں کہانی کو اس کے اصلی پیکر میں کس حد تک ڈھالنے میں کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ آپ کریں گے ...... میری اس بارے میں رائے کسی بھی لحاظ سے معتبر نہیں ہو سکتی۔

ساجد خان (حویلیاں)

مجھے روشنی چاہیے......

میں اچانک بیمار نہیں ہوا تھا بلکہ ایک عرصہ سے جسمانی تکالیف سے دوچار تھا۔درمیانی عرصے میں میں بہت سے ڈاکٹروں اور حکیموں سے ادویات لیتا اور استعمال کرتا رہا۔اب تو حالت یہ ہو چکی تھی کہ ٹھیک طرح سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔کمزوری پورے وجود میں سرایت کر چکی تھی۔ کبھی کبھار وہ دن شدت سے یاد آتے جب جسم کے اندر طاقت اور توانائی تھی۔اب تو سب خواب سا محسوس ہوتا ہے۔بیماری بڑھتی گئی اور پھر ایک روز میں ہسپتال جا پہنچا۔مجھے کس نے ہسپتال داخل کرایا...... کچھ یاد نہیں آ رہا تھا...... میں سن سکتا تھا، دیکھ سکتا تھا اور محسوس بھی کر سکتا تھا...... مگر نہ تو بول پاتا اور نہ ہی اشارہ کرنے کی ہمت تھی۔

میرے گھر والے،عزیز رشتے دار اور دوست احباب میرے پاس حاضری لگوانے آتے...... جو بھی مجھے دیکھنے آتا میرا جائزہ لینے کے بعد میرے بیٹے سے کچھ دیر تک کھسر پھسر کرتا...... جس کی مجھے سمجھ تو نہ آتی...... مگر میں ان کے چہروں کو پڑھنے کی ناکام کوشش ضرور کرتا۔ڈاکٹروں کی ٹیم مجھ پر نت نئے تجربے کرتی...... کوئی کچھ تو کوئی کچھ کہتا...... مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اُن کی ساری مسیحائی صرف مفروضوں پر مبنی ہے......

میرے جسم سے بار بار خون لیا جاتا اور مختلف لیبارٹریوں کو بھجوا دیا جاتا۔میں روز روز کی اِس اذیت سے عاجز آ چکا تھا...... وہ شاید یہ نہیں جانتے تھے کہ میرے خون کا گروپ O+ve ہے۔جس کی دستیابی عام اور آسان ہے...... مجھے وہ دن یاد آنے لگے جب کبھی کسی کو خون کی ضرورت پڑتی تو ہم سب دوست بھاگے بھاگے خون کا عطیہ دینے پہنچ جاتے۔اب وہی خون بار بار نکال کر معائنہ کیا جا رہا ہے جس خون نے کئی زندگیوں کی شمعیں روشن کیں۔مجھے بار بار خون کا معائنے کے لیے بھجوانا بالکل بھی پسند نہ تھا مگر اس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہ تھا......

مجھے بچپن کی بہت سی باتیں یاد آ ئیں۔وہ دن میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا جب مجھے والد

اسکول داخل کروانے کے لیے لے گئے ۔اس دن میں نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے ۔مجھے جوتے ، بستہ، کتابیں سب کچھ نیا خرید کر دیا گیا تھا ۔جب میں واپس لوٹا تو گھر میں قدم رکھتے ہی میری والدہ قدرے تیز قدموں سے میری جانب لپکیں ۔مجھے دل سے لگا کر میرا ماتھا چومتے ہوئے بولیں "میرا بیٹا پڑھ لکھ کے آیا ہے ......"

پھر میرے جنم دن پر والد صاحب کا جوش وخروش، والدہ کا مسکراتا چہرہ، بہن کا کبھی برآمدے میں تو کبھی سجے سجائے کمرے میں بار بار چکر لگانا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ خوب اچھل کود کرنا ...... کیک کاٹتے ہوئے میرے دوستوں اور بہن کی سہیلیوں کا جوش وخروش ...... یہ سب کچھ کل کی بات لگتا تھا۔

مجھے وہ دن بھی یاد آیا جب میں نے پہلا روزہ رکھا تھا ۔موسم نسبتاً گرم تھا ۔والدہ نے روزے سے منع کیا جبکہ والد عادت بن جانے کی غرض سے اصرار کر رہے تھے ۔میں نے جیسے تیسے روزہ رکھ لیا ۔میری عمر بے حد کم تھی ......شاید چھ سال کے لگ بھگ ......عصر کی اذان ہوئی تو میرا روزہ افطار کرنے کو سخت جی کر رہا تھا مگر والدہ میرا دل بہلاتی رہی ۔والد مجھے اپنے ساتھ بازار لے گئے اور وہاں سے مختلف پھل لے کر دیئے ۔وہ میری پیاس سے آگاہ تھے اسی وجہ سے وہ میری توجہ مختلف جانب مبذول کیے جا رہے تھے ۔مجھے اچھی طرح سے یاد ہے میں اپنے حصے کے آم ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں بار بار اُچھال رہا تھا ۔ان دِنوں ہمارے محلے میں کسی کے گھر بھی فریج نہیں تھا ۔برف کے لیے بازار ہی جانا پڑتا تھا ......آج والد صاحب برف کچھ زیادہ ہی لے آئے تھے ۔میں اپنے آم اسی برف میں ٹھنڈے کر رہا تھا ۔جوں جوں مجھے پیاس ستاتی توں توں میں برف آموں والی بالٹی میں ڈالتا گیا ۔

جب میری چھوٹی بہن نے بھی اپنے آم اسی بالٹی میں ٹھنڈے کرنے کی ضد کی تو میرا اس سے جھگڑا شروع ہو گیا ۔میری ایک ہی رٹ تھی ......کیا اس کا روزہ ہے؟

والدہ گویا ہوئیں "بیٹا !اس کا روزہ نہیں ہے لیکن یہ تمہاری چھوٹی بہن ہے" ۔

والدہ نے پیار سے تھپکی دیتے ہوئے کہا "بیٹا! صبر کرو، روزے کا مقصد تو صبر کرنا ہے"۔

زندگی گزرتی گئی ...... ہم جوان ہوئے ...... بہن اپنے گھر کی ہوگئی۔ اس دن ہمارے گھر میں بڑی اداسی تھی۔ والدین خاموش بیٹھے گم سم کافی دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے جبکہ مجھے بھی گھر سونا سونا لگنے لگا تھا۔ پھر میری شادی کا دن بھی آیا۔ والدین کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ گھر میں رشتہ داروں، محلے داروں اور تعلق داروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ کچھ سالوں بعد مجھے اللہ رب العزت نے ایک بیٹے کے بعد بیٹی سے نوازا۔

جب والد صاحب ہمیں زیست کے سفر میں اکیلا چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے تو ہر جانب ویرانی ہی ویرانی محسوس ہونے لگی۔ والدہ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ والد کی وفات کے کچھ عرصہ بعد والدہ بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئیں ......

کچھ دنوں کے سوگ کے بعد ضروریات اور خواہشات میں ایسا اُلجھا کہ کبھی کبھار ہی والدین کی یاد آتی۔ پہلے پہل والدین کی قبر کی زیارت کرنے جاتا رہا پھر بات ہفتوں سے مہینوں اور مہینوں سے سال تک جا پہنچی ...... رفتہ رفتہ عید پر بھی جانا محال ہوتا گیا۔ بس گھر میں ہی دعا کر لیتے ...... مجھے بچوں کی فکر لاحق ہوئی۔ بیٹی کی تعلیم اور اچھے خاندان میں اس کی شادی، بیٹے کا بہتر مستقبل اور بڑے عہدے پر تعیناتی کی خواہش میرے خوابوں کا محور بن چکی تھی۔

خواہشات اور خوابوں میں یہ خبر ہی نہ ہوئی کہ زندگی تو گزر چکی ہے ...... سیاہ بال سفید، سرخ رنگت گندمی، مضبوط اعصاب کمزور اور جسم کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ اب ڈاکٹروں کے ہاں تسلسل سے جانا معمول بن گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد گھر والے بھی تنگ پڑنے لگے۔ بظاہر میرا خیال رکھنے والے اندر ہی اندر کچھ اور سوچ رہے تھے۔ ان کا ڈاکٹروں سے رابطہ بھی تھا۔ ایک دن میں نے خود سنا کہ کوئی کہہ رہا تھا "پندرہ دن مزید زندہ رہیں گے تو کیا ہوگا؟ بس دعا کریں کہ اللہ سنبھال لے۔ سخت اذیت میں مبتلا ہیں"۔

پھر دعا کی گئی کہ اللہ مجھے سنبھال لے" ...... وہ دن مجھ پر بے حد بھاری گزرا۔

دوسرے دن سب ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ انہیں گھر لے جائیں ۔میں گھر جانا چاہتا تھا مگر تکلیف تھی کہ دُور ہونے کا نام نہ لیتی تھی ...... جو کھاتا اُلٹ دیتا ...... میرا معدہ خوراک کا طلبگار مگر حلق دشمن تھا ...... منہ میں پانی ڈالا تو حلق نے قبول نہ کیا ...... کئی دنوں سے رفع حاجت نہ کر سکنے کی وجہ سے سر میں درد اور طبیعت میں عجیب بے چینی تھی ...... میرے دوست آتے ...... میرے سرہانے کھڑے ہو کر میری جانب دیکھتے تو ان کے چہروں پر افسردگی واضح ہوتی اور کچھ کی نظریں ملتے ہی آنکھیں چھلک پڑتیں ...... اُنہیں دیکھ کے میرا دِل بیٹھنے لگتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ میری بے چینی بڑھتی ہی گئی ...... ہسپتال والوں نے صاف جواب دے دیا مگر میرے گھر والے سب باتیں مجھ سے مخفی رکھنا چاہتے تھے۔جب میرے بیٹے نے مجھے گھر جانے کا کہا تو مجھے بہت بُرا لگا ۔میں نے اُس کی جانب حیرت سے دیکھا ...... میں کہنا چاہتا تھا کہ میں بیمار ہوں ۔

وہ میری نظروں میں پوشیدہ سوال پڑھ چکا تھا ۔میری ڈھارس بندھاتے ہوئے کہنے لگا "آپ ٹھیک ہو جائیں گے ...... ڈاکٹروں سے میری بات ہو چکی ہے ...... وہ یہی کہہ رہے ہیں کہ ان کا علاج گھر پہ مناسب رہے گا"۔

پھر مجھے اٹھا کر کرسی پہ ڈالا گیا ۔ مجھے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا ۔جب کرسی چلائی گئی تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی سرکس میں گھومنے والے پنگھوڑے میں بیٹھا ہوں ۔ مجھے جیسے تیسے گھر پہنچایا گیا ۔محلے داروں، تعلق داروں کا جمِ غفیر تھا ۔کوئی کچھ کہتا تو کوئی کچھ ......

میرے سامنے میرا بیٹا کچھ افسردہ سا کھڑا تھا ۔وہ جب چھوٹا سا تھا تو اُس کی توتلی باتیں سن کر بڑا سرور ملتا تھا ۔میں جان بوجھ کر اُس سے باتیں کرتا رہتا ۔وہ ہر لفظ کے آخر میں "ز" اور "ش" کا اضافہ کرتا ...... ان دِنوں بجلی کم کم ہی میسر ہوتی ۔میں اس کے لیے ہاتھ والا پنکھا لے آیا تھا ۔سارا دِن اُس کی ماں، پھوپھی یا بہن اُسے پنکھا جھولاتیں ۔جب میں گھر میں ہوتا تو یہ کام اپنے ذمے لے لیتا ۔وہ راتیں بھی یاد آنے لگیں جب پوری رات میں اور میری شریکِ حیات اس کو پنکھا

جھولتے رہتے تا کہ اُسے گرمی اور مچھروں سے محفوظ رکھ سکیں۔

سامنے کھڑی میری اکلوتی بیٹی (جس کو میں اپنے دل کا ٹکڑا سمجھتا تھا) میرے چہرے کا بھرپور جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پھیلی افسردگی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے ہشاش بشاش چہرے پہ غم کی لہر واضح نظر آ رہی تھی۔

اس لمحے مجھے اپنی شریکِ حیات کی یاد شدت سے آنے لگی جو مجھے زندگی کے اس سفر میں داغِ مفارقت دے گئی تھی ...... وہ ہوتی تو بے حد شور مچاتی۔ وہ میری ذرا سی تکلیف پہ چلا اٹھتی تھی۔

میرے پورے وجود میں صرف آنکھیں تھیں جو میری زندگی کے آثار کا پتا دے رہی تھیں۔ کوئی میرے جسم کو ہاتھ لگاتا تو قدرے سکون محسوس کرتا ورنہ پورا جسم ہی سُن ہو چکا تھا۔ چھو لینے پہ اپنے ہونے کا احساس ہوتا ...... میں اپنی بیٹی اور بیٹے سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں طویل عرصہ اُن کے ساتھ گزارنے کا متمنی تھا۔

اب مجھ پہ غنودگی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ کئی کئی گھنٹے مجھے ہوش نہ رہتا تھا۔ جب قدرے سنبھلتا تو بچوں کے افسردہ چہرے میرے سینے میں آگ لگا دیتے۔ سب مجھ سے باتیں کرنا چاہتے تھے مگر میں لاکھ کوشش کے باوجود بول نہ پاتا تھا۔

سامنے دیوار پہ میری جوانی کی مسکراتی ہوئی تصویر آویزاں تھی۔ میرے پہلو میں بیٹا اور گود میں بیٹی تھی۔ یہ تصویر غالباً تیس سال پہلے کی تھی۔ مجھے اِس بستر پر پڑے پڑے بھی کئی برس بیت گئے تھے ...... مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ان تیس برسوں میں کوئی ایسا قابلِ ذکر کام نہ تھا جو مجھے یاد آ رہا ہو۔ بس زندگی کے شب و روز کی گنتی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

مجھے ہسپتال سے گھر آئے پانچ دن گزر چکے تھے۔ اب میرے سرہانے بیٹھ کر کچھ لوگ تلاوت کر رہے تھے۔ سامنے بیٹھی میری بھانجی زیرِ لب کچھ پڑھ رہی تھی۔ میرا لاڈلا بیٹا کہاں ہے؟؟ میری نظریں اسے تلاش کر رہی تھیں ...... شاید وہ کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔

مجھ پہ غنودگی غالب آنے لگی تھی۔ میں اپنی آنکھیں کھولنا چاہتا تھا مگر وہ کھلنے سے قاصر تھیں۔ سب

لوگ اونچی اونچی آواز میں کلامِ پاک پڑھے جا رہے تھے۔میرے کان کے ساتھ کسی نے اپنے ہونٹ لگائے ...... مجھے اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائیں سنائی دیں۔میں نے اپنی آنکھوں کو بہت زور لگانے کے بعد کھولا۔اِس پل مجھے ایسا لگا کہ سب کے چہروں پہ مسکراہٹ پھیل رہی ہے،۔سب کے سب اندر سے بے حد خوش ہیں ......پھر نہ جانے انہیں کیا ہوا ......ہر ایک کا چہرہ غم سے افسردہ ہونے لگا ......جب میری سانسیں ڈوبنے لگیں تو اُن کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

مجھے ایک چیخ سنائی دی ......کسی نے دور سے میرے بیٹے کو صدا لگائی ......وہ بھاگا بھاگا میرے پاس آ کر مجھ سے لپٹ کر رونے لگا، ......میری اکلوتی بیٹی کی آنکھوں سے آنسو میرے قدموں پہ گر رہے تھے ......اس کے گرم گرم آنسوؤں کو میں نے اپنے پاؤں پر محسوس کیا تھا۔کان کے ساتھ ہونٹ لگائے کوئی شخص نبی آخر الزمان رسول برحق ہونے کی شہادت دے رہا تھا۔

میں سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی ۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب صبح سویرے میں کھلی فضا میں کھڑے ہو کر سورج کی کرنوں کو غور سے دیکھا کرتا تھا۔آج مجھے سورج غروب ہوتے وقت کی سرخی دکھائی دے رہی تھی ۔نہ چاہتے ہوئے بھی میری آنکھیں جو میری زندگی کی واحد نشانی بتائی جاتی تھیں بند ہو چکی تھیں۔

تدفین کی تیاریاں شروع تھیں ۔میری ٹانگیں اور بازو درست کیے جا رہے تھے۔میرے ہونٹوں اور آنکھوں پر کسی نے نرم گرم ہاتھ پھیرے ......انگلیاں سیدھی کی گئیں ......مجھے غسل دیا جانے لگا ...... کفن پہنا کر خوشبوئیں چھڑکی گئیں ۔مجھے اِن تمام مراحل سے میرے چاہنے والوں نے اچھی طرح سے گزارا ......دوسری جانب بہت سے افراد اپنی گھڑیوں کو بار بار دیکھے جا رہے تھے ۔شاید میرا دنیا میں مزید قیام اُن کے لیے ناگوار تھا،وہ جلد از جلد مجھے مٹی میں ملانے کے لیے بے چین تھے،میرا بیٹا میری میت اٹھانے پہنچا تو میری بیٹی ،بہن اور بھانجیاں اُس سے لپٹ گئیں مجھے بھی بے حد دکھ ہو رہا تھا ......پھر اِدھر اُدھر سے آوازیں آنا شروع ہو گئیں ......اٹھاؤ......اٹھاؤ......چلو چلو...... وقت کم ہے......وقت کم ہے ......لوگ انتظار کر رہے ہیں ......

میری نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور تدفین کے عمل میں سب شریک ہوئے، جب مجھے قبر میں اتارا گیا تو کسی نے میرے بیٹے کو آواز دی ...... اپنے والد کا آخری دیدار کرلو شاید اب تمہیں خوابوں میں ہی ملے ...... میرے چہرے سے تھوڑی دیر کے لیے کفن ہٹایا گیا پھر کفن کی گرہیں کھولی گئیں، میرے اوپر سل رکھنے کا عمل شروع ہو چکا تھا، سوراخوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر رکھے جا رہے تھے اور سلوں پہ منوں مٹی کا وزن ...... کسی نے میری قبر کے سر والی جانب بڑی سل گاڑ دی تھی، سارے سوراخ بند کیے جا رہے تھے۔ مٹی مٹھیاں بھر بھر ڈالی گئی، عطر کا چھڑکاؤ ہوا، میرے بیٹے نے قبر پہ پھول کی پتیاں ڈالیں ...... پھر آہستہ آہستہ سب چلتے بنے ......

رات ہوئی تو میری قبر اندھیرے میں ڈوب گئی ...... سب جانتے ہیں مجھے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے ...... تب مجھے دُور بہت دُور سے روشنی آتی دکھائی دی ...... یہ روشنی اسی طرح کی تھی کہ جب کوئی کسی ویرانے اور اندھیرے میں سفر کرے تو دور کی روشنی کس قدر اطمینان بخش ہوتی ہے۔ روشنی میری طرف بڑھ رہی تھی ...... اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ میری قبر میں پہنچ آئی ...... روشنی دو ہاتھوں میں اٹھایا ہوا ایک دیا تھی ...... میں نے ہاتھ پہچان لیے۔ یہ میری بیٹی کے ہاتھ تھے۔ میں نے اُسے جھڑکا کہ اتنی دیر سے دیا کیوں لائی ہو؟ ...... وہ دیا مجھے پکڑا کے بغیر بات کیے واپس لوٹ گئی۔

دوسرے دن پھر قبر میں اندھیرا تھا۔ میں اپنی بیٹی کی راہ تکتا رہا مگر وہ دیا نہ لائی ...... کچھ دنوں بعد ایک اور دیا میرے پاس لایا گیا۔ اس بار میری بیٹی کی بجائے بیٹا تھا۔ میں نے بیٹے سے قدرے ترش لہجے میں کہا کہ مجھے روزانہ روشنی کی ضرورت ہوتی ہے ...... تم روزانہ دیا لایا کرنا ...... وہ ایک دیا میرے حوالے کرکے بغیر بات کیے لوٹ گیا۔

اب مدتیں گزر چکی ہیں۔ میری بیٹی اور بیٹا نجانے کہاں ہیں؟ وہ دیا لے کر نہیں لوٹے ...... میرے اڑوس پڑوس جب کبھی دیا جلایا جاتا ہے تو روشنی کی ہلکی سی رمق میری طرف بھی آتی ہے ...... اور میں اپنی قبر میں چلاتا رہتا ہوں ......؟ مجھے روشنی چاہیئے ...... مجھے روشنی چاہیئے۔

دائرے کا اسیر

کچھ دنوں سے میں عجیب سے خیالات کے زیرِ اثر تھا ......اکثر بیٹھے بیٹھے ایسا محسوس ہوتا کہیں دُور خلاؤں میں گھوم رہا ہوں ......

مجھے لگنے لگا کہ وہاں بہت سی اور دنیائیں آباد ہیں ......جن کی کھوج ہم نے ہی کرنی ہے ......جن کے خط وخال بے حد خوبصورت تھے ......من چاہا کہ چھو لوں ......سوچتے ہی جسم میں ایک لہر سی کوند گئی ......نجانے کس لمحے میرے اندر سویا سو کر جاگ اٹھا ......میں نے لمس محسوس کیا اور جسم کا حظ اٹھاتے ہوئے انجام کو جا پہنچا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دُنیا میں جانور انسانی شکلوں میں بھی موجود ہیں ......انسانوں میں اور بھی بہت سی قسمیں ہیں ......بعض تماشا دیکھتے ہیں ......بعض تماشا بناتے ہیں اور بعض تماشا بنتے ہیں۔

تم کون ہو؟ ......اُس نے اچانک سوال داغ دیا۔

م ...... مے ......میں ......میں بہروپیا ہوں۔

واقعی ......؟ ......وہ قدرے حیرانی سے پوچھنے لگا۔

ہاں ......اِس میں حیرانی کی کون سی بات ہے ......؟؟؟

وہاں کیا ہو رہا تھا؟؟ ......اُس نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

وہاں کتے بھونک رہے تھے ......

چوزے کے پیچھے بلوٹا اور بلوٹے کے پیچھے پلا بھاگ رہا تھا ......بھیڑیا بھیڑی کو پکڑنے کی کوشش میں تھا وہ سرپٹ دوڑ رہی تھی ......سامنے لومڑیاں آپس میں چھیڑ خانی کر رہی تھیں ......بندر اُنھیں دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے ......چڑیاں شور مچا رہی تھیں ......کوے اپنی ہی دُنیا میں مگن تھے ......گدھے لمبی تانے سو رہے تھے ......قدرے دُور ایک جانب سور بھی کھڑے تھے ......جب کتے زور سے بھونکنا شروع ہوئے تو میرے اندر بیٹھا کتا بھی جاگ اٹھا اور بھونکنے لگا۔

وہ کیوں بھونک رہے تھے؟ ......وہ تفصیل جاننا چاہتا تھا۔

وہاں ایک کتے کی موت ہوئی تھی۔

پھر ......؟؟؟ ......اُس نے استفسار کیا۔

پھر ایک کتے کے بدلے تین انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار اگیا۔
مسئلہ کیا تھا......؟ ......وہ دلچسپی لینے لگا تھا ......مسئلہ صرف ہٹ دھرمی کا تھا۔
ایک کتے کے بدلے تین قیمتی انسانی جانوں کا بے دریغ قتل؟؟ ......وہ مضطرب سا ہو گیا تھا۔
کیا اِسکے علاوہ بھی کوئی عداوت تھی؟؟ ......سوال کرتے وقت اُسکا چہرہ مغموم سا نظر آرہا تھا۔
نہیں اور کوئی بات نہ تھی ...... جواب سن کے اُس کے چہرہ حیرت زدہ ہو گیا
اُنکے آپس کے تعلقات کیسے ختم ہوئے ......اُس نے تعلقات بارے سوال داغا
یاد رکھو......تعلقات فطرتی طور پر کبھی بھی ختم نہیں ہوا کرتے ......اِن کا ہمیشہ قتل ہوا کرتا ہے اور اِس قتل کی وجہ ہمارے رویئے، جھوٹی انا، جذباتیت، مفادات اور دوسروں کو کمتر سمجھنا ہوا کرتا ہے......
دوسری طرف اچانک زور سے دستک ہوئی ...... میں نے پوچھا کون؟؟ ......نجانے کیوں اس سے میری آواز لرزسی گئی تھی ......کوئی جواب نہ پا کر میں فکرمند ہوا شائد وہ لوگ میرا تعاقب کر رہے تھے ......میں جلدی سے اٹھا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ مسلسل دوڑنے کے بعد ستانے کے لئے ٹھہرا ...... پیچھے مڑ کے دیکھا ......تو ایک لمبا قد ...... مضبوط جسم ......میرے تعاقب میں تھا۔ اس کی جانب دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی ......وہ بے چہرہ تھا......!!!
خوف کے مارے میرا جسم نڈھال ہونے لگا میں ہانپتا کانپتا سرپٹ دوڑنے لگا ......
وہ کیا چاہتا تھا؟؟ ......میں نے بھاگتے ہوئے خود سے سوال کیا......شائد عمل ......کیسا عمل......؟؟ میں سوچنے لگا ......وہ چاہتا تھا......میں اس کی بنائی گئی قبر میں رہوں۔
سامنے ایک نئی قبر کھودی گئی تھی ......نئی ہونے کے باوجود شکستگی عیاں تھی ......اطراف میں لگائے گئے تہہ در تہہ پتھر ذرہ بھی خوبصورت نہ تھے اُن میں سوراخ دیکھ کر میں تو گھبرا گیا ......میرے اندر اندھیرا پھیلنے لگا ......جسم میں بے چینی سرایت کر گئی ......میں اُداس ہو گیا۔ ایسے لگا جیسے کلیجہ حلق میں اٹکا ہوا ہو......اچانک اس نے مجھے پکڑ لیا......میں نے اُس سے پوچھا ......تم کیا چاہتے ہو......؟؟؟
اس نے قبر کی طرف انکھیوں سے اشارہ کیا۔
کیا مجھے یہاں رہنا ہے......؟؟؟
اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔
نہیں میں یہاں نہیں رہ سکتا......میں نے ترش لہجے میں کہا......میں تو نرم گداز بستر پہ سونے کا

عادی ہوں ......مٹی سے ہمیشہ خود کو بچایا ......میرے گھر ماربل اور خوبصورت نقش و نگار سے مزین ٹائلیں لگی ہیں ......مگر وہ مُصر تھا ...... میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ زبردستی پہ اتر آیا ......وہ مجھ سے بہت طاقتور تھا......میں نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی ۔

وہ پھر سے میرے پیچھے بھاگنے لگا ......پھر نجانے کتنی ہی دیر ہم دونوں بھاگتے ہی رہے ......بھاگ بھاگ کر جب میں تھکاوٹ سے نڈھال ہوا تو اُس نے مجھے دبوچ لیا ...... میں تھر تھر کانپ رہا تھا......جو جہاں تھا......جیسا تھا......رک چکا تھا......مجھے جان کے لالے پڑ گئے ...... میں نے زور سے چیخ ماری مگر میری کوئی نہیں سن رہا تھا......اُس کی ایک ہی منشا تھی ...... مجھے یہاں ہر صورت رہنا ہے......مجھے ایسے لگا میں مر چکا ہوں ۔موت کے احساس نے میری سٹی گم کر دی ......اب میں نے کب زندہ ہونا ہے شاید صدیوں بعد میری قبر کا تو نشان تک مٹ ہو جائے گا......اُس لمحے میں سسکیاں بھر بھر رونے لگا ...... مجھے خاموش کروانے اور ڈھارس بندھانے والا کوئی نہ تھا......میں نے لوگوں کی طرف دیکھا......سب تماشائی تھے ......میں تنہا......بالکل تنہا تھا ......اتنا تنہا کہ تنہائی بھی دنگ رہ گئی ......سامنے گھنے درخت، خود رو جھاڑیاں اور کانٹے ہی کانٹے تھے ......جن میں موت کی بو پھیلی تھی ۔

میں حیرت زدہ رہ گیا اور تحیر میں ڈبکیاں کھانے لگا ......مجھے لگا چاروں اور ویرانی ہی ویرانی تھی ......وقت کا احساس شدت سے دامن گیر تھا......وہ وقت جو ٹل نہ سکتا تھا ۔آج جامد ہو چکا تھا...... مجھے کچھ سجھائی نہ دیا تو میں نے زور سے چیخ ماری ......میری چیخ دوسری چیخوں میں دب کہ رہ گئی۔

اُس لمحے ہر جانب چیخیں گونج رہی تھیں ...... میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا ......احاطے سے قدرے دُور کچھ اور نئی قبریں بھی تھیں ......جن میں رہا جا سکتا تھا ......میں نے التجا کی مجھے ان میں سے ایک قبر دی جائے ۔

وہاں کھڑا بس مسکرا دیا ......اُس کی زیرِ لب مسکراہٹ میں کئی معنی پوشیدہ تھے ...... مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہنے لگا......آگے کی راہ لو......یہاں کا کرایہ تمھاری دسترس سے باہر ہے ...... مجھے اس بات پہ بے حد غصہ آیا ...... میں نے اپنی جیب سے بہت سے سکے نکالے اور اس کے سامنے رکھ دیئے ......سکے دیکھتے ہی بے زاری سے کہنے لگا ...... سکے اُٹھاؤ!......یہ سکے یہاں نہیں چلتے ۔

میں نے وہاں کی کرنسی کے متعلق پوچھا......تو اُس نے مجھے سفید چمکتے سکے دکھائے جو میں نے اس

سے قبل کبھی نہ دیکھے تھے۔
یہ سکے کہاں سے اور کیسے حاصل کیے جا سکتے ہیں؟؟ اُس نے مجھے ساری معلومات دیں تو میں پریشان ہوگیا...... مجھے یقین ہو چلا کہ اب مجھے تماشا بننے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔
میں وہاں سے قدرے آگے نکلا ......وہاں ہر جانب خوشبوئیں پھیلی تھیں۔خوشبو کا سونگھنا تھا کہ میں خود کو معطر محسوس کرنے لگا ......ایک مسحور کن لہر میرے جسم میں پھیل گئی......سامنے بلند مسندوں پہ کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ایک جانب خوبصورت ،سفید، چمکتے چھریرے بدن حرکت کر رہے تھے...... میں نے غور سے دیکھا......میری حیرت کی انتہا نہ رہی......وہ تو نرم و نازک، پتلی لمبی عورتیں تھیں۔ایسی خوبصورت عورتیں میں نے کبھی نہ دیکھی تھیں۔وہ مستی بھرے انداز میں جھوم رہی تھیں۔ان کے جسم ایک خاص لے پہ حرکت کر رہے تھے۔مجھے ایسا لگا وہ کسی شے کے گرد دائرے میں چکر لگا رہی ہیں...... عجیب سرور و مستی میں ان کا لہک لہک کر چلنا......اُن کی نازک ادائیں......بڑی بڑی آنکھیں......عجیب سی کشش رکھتی تھیں......لانبے لانبے گیسو جو ٹخنوں کو چھو رہے تھے......زمین کی جگہ پانی تھا جس کے اوپر وہ پھسلی پھسلی جا رہی تھیں......جی چاہنے لگا میں اُنہیں چھولوں۔
اچانک کسی نے میری گردن دبوچ لی......میں نے گردن چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر اُن آہنی ہاتھوں کی مضبوط گرفت سے نکلنا محال تھا......میں کچھ دیر زور لگاتا رہا پھر نجانے کب میری طاقت جواب دے گئی......میں خود کو بے بس محسوس کرنے لگا......
وہ مجھے گھسیٹنے لگا...... درد سے میری گردن ٹوٹ رہی تھی......گردن پہ دباؤ سے آنکھیں پھٹنے کو تھیں......خوف سے میرا جسم کانپنے لگا سخت دباؤ سے سانس لینا مشکل تھا......سامنے مسندوں پہ بیٹھے لوگ میری جانب دیکھنے لگے۔میں چاہتا تھا وہ میری مدد کریں مگر وہ مجھ سے بیزار تھے......سب میرا تماشا دیکھ رہے تھے......میں اُن لوگوں میں کوئی شناسا چہرہ ڈھونڈنے لگا......جو میری اس آہنی گرفت سے خلاصی کراوئے...... مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک ڈھیر پہ پھینک دیا گیا......وہاں بے حد تیز بدبو تھی......اِس قدر تعفن کہ سانس لینا محال تھا...... مجھے خود سے گھن آنے لگی......پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے......آنتیں بل کھانے لگیں......ایسے لگا سب کا سب منہ سے باہر نکل آئے گا......میری اذیت میں اضافہ ہو رہا تھا......میں نے دیکھا بڑی مسندوں پہ بیٹھنے والوں کا دروازہ بند ہو چکا وہاں ایک بے چہرہ طاقتور جسم کھڑا ہے جسے دیکھ کر میں خوف کھانے لگا اب اس جانب

جانا ناممکن تھا ......میں سوچوں میں ہی تھا کہ ایک شفاف جسم میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا .....میری نظر اس کے پاؤں جانب اٹھی تو آئینے کی طرح شفاف فرش حد نگاہ تک پھیلا تھا ...... جب کہ غلاظت پہ صرف میں ہی کھڑا تھا ......

کس سے ڈر کر بھاگ رہے ہو؟ ......اُس نے نرم لہجے میں پوچھا ۔

م ...... ے ......میں!!

تم جس سے بھاگ رہے ہو......اُس سے تم نہیں بھاگ سکتے

یوں ......میں نے کریدتے ہوئے پوچھا

اپنے آپ سے بھی بھلا کبھی کوئی بھاگ سکتا ہے......؟؟؟ ......اس نے پیار بھری نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے سفید موتی جیسے دانتوں کی چمک سے میری آنکھیں چندھیا گئیں ۔

جب یہ الفاظ میرے کانوں تک پہنچے تو اس کے ہونٹوں کی جنبش سے خوشبو چار سو پھیل چکی تھی ۔

اُس کی منت سماجت کرتے ہوئے میں نے راستہ پوچھا ......اور اپنے سکے اس کے سامنے رکھ دیئے۔

وہ کچھ سوچنے لگا ...... ۔میں نے التجا کی کہ وہ میری مدد کرے .....اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا ......شائد یہ ممکن نہ ہو ......

میں رونے لگا تو وہ کہنے لگا ......میں جانتا ہوں ......تم تنہا رہ گئے ہو ......مگر کیا تم نہیں جانتے تھے کہ سب تنہا ہوتے ہیں ......اپنا ساتھی تو خود بنانا پڑتا ہے۔

ہاں جانتا تھا پر ......جواب دینے کے بجائے میری گھگھی بندھ گئی۔

اچانک کسی جانب سے شور بلند ہوا ......الفاظ حد درجہ کرخت تھے جو سماعت پہ گراں گذر رہے تھے ۔

میں نے آوازوں بارے استفسار کیا ......تو وہ زیرِ لب مسکرا دیا ......مسکرانے کی وجہ پوچھی تو بے زاری سے کہنے لگا ......کیا اپنی آواز اور الفاظ بھی نہیں پہچان سکتے ......مجھے سراندی محسوس ہوئی اور سانس لینا پھر سے مشکل ہو گیا ......وہ میری حالت بھانپ کر کہنے لگا ......بدبو محسوس کر رہے ہو ......؟؟؟ ......میں بمشکل ہاں کہہ سکا۔

یہ تمھارے اندر کے غلاظت ہے جو بدبو کی صورت تم محسوس کر رہے ہو۔

میں اِس مصیبت سے خلاصی چاہتا تھا۔

وہ کہنے لگا ...... پیچھے دیکھو! میں پیچھے مڑا تو وہاں میری صورت کا ایک اور کھڑا تھا۔ پہلے لگا آئینہ ہے جس میں میں خود کو دیکھ رہا ہوں ...... مگر وہ میری تصویر تھی ...... پھر وہ جسم حرکت کرنے لگا ...... وہ میں نہ تھا ...... میرا دوسرا جسم تھا ...... بے وزن جسم ......

اپنے جیسا ایک اور دیکھ کر میں کچھ گھبرا سا گیا ...... اگر میں یہ ہوں ...... تو وہ کون ہے ......؟؟ ......

اور اگر میں وہ ہوں تو میں کون ہوں ......؟؟

میں ٹپٹا سا گیا۔

یہ کون ہے؟؟ میں نے روشن جسم سے ہکلاتے ہوئے پوچھا ...... وہ کرخت اور قدرے رعب دار آواز میں کہنے لگا .... تم نے صرف ایک نقطے میں ساری زندگی گزاری تھی ...... اس نقطے کی زندگی نے آج تمھیں دائرے میں ذلیل و رسوا کر دیا ...... وہ وقت جس کی پاداش میں آج تم ٹھوکریں کھا رہے ہو ...... صرف ایک ساعت تھی تم اس ساعت کے امتحان میں پیچھے رہ گئے ہو۔

مگر کیوں؟ میں نے وجہ پوچھی۔

تم نے اُس ساعت میں داغ دھونے تھے اور اُن داغوں کی جگہ روشنی نے لینی تھی۔

اچانک قوسِ قزح سے کہیں زیادہ دلکش رنگ ایک دوسرے میں ملتے ملاتے عجیب منظر پیش کرنے لگے ...... ڈھیر ے ڈھیر ے مختلف رنگ سفیدی میں بدلتے جا رہے تھے ...... تھوڑی ہی دیر میں ہر جانب سفیدی پھیل چکی تھی ...... میں جس جانب بھی دیکھتا ...... آنکھیں چندھیا دینے والی سفید روشنی تھی ...... کبھی تو ایسے لگتا کہ ہر جانب آئینے ہیں جو روشنی کو منعکس کر رہے ہیں ...... یہ دیکھ کر میرا جسم یخ ہو چکا تھا ...... مگر پسینہ پھر بھی آ رہا تھا ...... سب دیکھ کر بھی سب میرے حواس سے ماوراء تھا ...... میں اس کے پاؤں پڑنے کو تھا کہ وہ غائب ہو گیا ...... شاید سامنے تاریکی میں دیوار کی اُس جانب جا چھپا تھا۔

مگر ...... نہیں ...... اُس کا روشن جسم تو سامنے والی تیز روشنی میں مدغم ہو گیا تھا ...... میں فضا میں دیکھنے لگا جو تا حدِ نظر پھیلی ہوئی تھی ...... میں دائرے میں کھڑا تھا ......

یہ دائرہ ایک اور دائرے میں ضم اور وہ دائرہ ایک اور دائرے میں ختم ...... ہر دائرے کے بعد ایک اور دائرہ ...... تا حدِ نظر ...... یہ سلسلہ جاری تھا ...... سارے تماشائی جا چکے تھے!!!!